اُردو شاعری میں خودداری
سلام سندیلوی
انجمن ترقی اردو ہند اردو گھر راؤز ایونیو ۔ نئی دہلی

اُردو شاعری میں خودداری

اُردو شاعری میں خودداری

سلام سندیلوی

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی ۴۸۸

اُردو شاعری میں خودداری۔ سلام سندیلوی

سن اشاعت ۱۹۷۹ء

قیمت ~~چھ روپے~~ ۱۰/-

طباعت جمال پرنٹنگ پریس دہلی

کتابت محمد احسن بجنوری

انجمن ترقی اُردو (ہند)، اُردو گھر، راؤز ایونیو نئی دہلی

فہرست

ڈاکٹر سلام سندیلوی

اُردو شاعری میں خودداری

فرائڈ نے خودداری کو نرگسیت کا ایک جزو قرار دیا ہے[1]۔ اس کے علاوہ کیرن ہارنی نے بھی خودداری کو نرگسیت کے دائرے میں شامل کیا ہے[2]۔ دراصل خودداری ایک فطری جذبہ ہے جو انسان سے اسی طرح پیوستہ رہتی ہے جیسے طرح پھول میں خوشبو بسی ہوتی ہے یا چراغ میں روشنی موجود ہوتی ہے۔ خودداری کا تعلق انسان کی داخلی شخصیت (Inner self) سے ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت ایک شریف انسان کی علامت ہے جو خوشگوار رجحان کی غمازی کرتی ہے۔ خودداری اگر حدود کے اندر انسان میں موجود ہو تو یہ کوئی معیوب جذبہ نہیں ہے بلکہ اس سے اس کی شخصیت میں تابنا کی اور درخشندگی پیدا ہوتی ہے۔ مگر جب خودداری حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو وہ انسان اور سماج دونوں کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔

---

1. General Psychological theory by Freud, edited by Philif Rieff P. 78
2. New ways in Psycho analysis by Karen Horney P. 88

قبل اس کے کہ ہم خودداری پر غور کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم خود کو سمجھ لیں۔ خود کو انگریزی میں SELF کہتے ہیں۔ ہم خود کو "انا" اور "ایگو" کے مفہوم میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم خود کا اطلاق اپنی ذات پر بھی کر سکتے ہیں۔ جب انسان اپنی ذات کی پرستش میں معروف رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری توجہ خود پر مرکوز ہے۔

گارڈنر مرفی کا قول ہے کہ جب بچہ چند ماہ کا ہوتا ہے، اسی وقت سے وہ اپنی ذات سے آگاہ ہونے لگتا ہے۔ جب وہ لڑھکتا اور مچلتا ہے یا اپنے انگوٹھے سے کھیلتا ہے اس وقت وہ اپنی ذات سے واقف ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی ذات سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے، اور اپنی جسمانی حرکات سے محظوظ ہوتا ہے۔ اسی وقت سے وہ اپنی ذات سے محبت کرنے لگتا ہے۔ بچہ جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے اسی رفتار سے وہ اپنی ذات سے محبت کرنے کے رجحان میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔[1]

انسان جب اپنی ذات سے محبت کرتا ہے تو وہ چار مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۔ وہ سب سے پہلے اپنی جسمانی ترقی کی خواہش کرتا ہے۔
۲۔ اس کے بعد وہ دنیا کی مختلف اشیا کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے
۳۔ وہ اپنی عزت اور قدر و منزلت بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔
۴۔ وہ اپنے اختیارات کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہتا ہے۔

انسان اپنی خودداری کی ترقی کے لیے ان مقاصد کو مختلف ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔[2]

ڈبلو ڈی سی ہیکل لنیڈ نے بھی انسانی ذات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا قول ہے کہ چوں کہ انسان ساری کائنات کا علم رکھتا ہے، اور انسان کائنات کے اندر داخل

An Introduction to Psychology by Gardner Murphy P. 408 [1]

An Introduction to Psychology by Gardner Murphy P. 410, 411 [2]

ہے۔ اس لیے انسان کو اپنی ذات کا بھی علم ہوتا ہے۔[1]

برنین نے بھی ذات (EGO) کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اس کا قول ہے کہ انا کے اصول کے تحت انسان کی اپنی ذات کے بارے میں واقفیت کا نام ہے۔[2] اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ انا کے تین مفہوم ہیں۔ پہلا مفہوم نفسیاتی اعتبار سے ہے۔ اس صورت میں انا قوتوں، عادتوں اور مختلف کاموں کے اتحاد کا نام ہے جس کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انا انسان کی شخصیت کا دوسرا روپ ہے۔ انا کا دوسرا مفہوم اخلاقی حیثیت سے ہے جس کو ہم کردار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس مفہوم کا تعلق دماغ کی بہ نسبت قوت ارادی سے زیادہ ہے۔ انا کا تیسرا مفہوم علم الوجود سے تعلق رکھتا ہے۔ قوت۔ عادت شخصیت اور کردار کے وجود کے لیے انسانی جسم کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ انا کا اظہار ہوتا ہے۔

انا کے وجود کے سلسلہ میں مختلف تجربات کئے گئے ہیں۔ پہلا تجربہ تو معمولی مشاہدہ کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ مثلاً میں کسی چیز کا مالک ہوں۔ یادداشت مجھ کو یہ بتاتی ہے کہ میں وہی انسان ہوں جو دس، بیس یا تیس برس قبل تھا۔ یہ کیفیات معمولی اشیاء سے شروع ہو کر اعلیٰ احساسات تک پہونچتی ہیں۔ تجربہ کا دوسرا طریقہ سائنٹفک مشاہدہ پر مبنی ہے، ولیم میکڈوگل کا خیال ہے کہ ذات کے علم کا انحصار ہماری کوششوں پر ہے خصوصاً جب ہم کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سعئ عمل سے کام لیتے ہیں۔ ایک انسان اپنے بارے میں یہ سوچتا ہے کہ اس کو اشیاء کے بارے میں علم حاصل ہے۔ وہ جدوجہد کرتا ہے۔ وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ اس کو غم کا بھی تجربہ ہوتا ہے، وہ کچھ باتوں کو یاد بھی رکھتا ہے اور کچھ باتوں کے لیے توقع بھی رکھتا ہے۔ چارلس اسپرمین (Charles Spearman) بھی انا کے وجود کی جانچ فوری تجربات کی روشنی میں کرتا ہے۔

---

1. Personality by David C. Mcclelland P. 529
2. General Psychology by Robert Edward Brennan P. 350

سینٹ ٹامس کا قول ہے کہ عقل کو انا کے وجود کا علم اس کے افعال کے ذریعہ ہوتا ہے اس لیے اس کی نظر میں انا ایک عقلی خصوصیت کی شے ہے کیوں کہ عقل اس کی بلند ترین ملکیت ہے۔ عقل کی مدد سے آزادی حاصل ہوتی ہے جو اس کو مقدس اور قابلِ احترام بناتی ہے۔ اس طرح انسان اپنی جگہ پر مفکر اور فاعل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنی قوت سے کام لے کر اپنی قسمت کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے۔

انا مطالعہ باطن سے بھی کام لیتا ہے۔ لیونارڈ ٹرولینڈ (Leonard Troland) نے یہ بات واضح کی ہے کہ انا کسی خاص مسئلہ پر فوراً کس انداز سے سوچتا ہے اور لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ کسی چیز کی ان خصوصیات کا مطالعہ کرتا ہے جو حواسِ خمسہ کے اندر ہیں۔ پھر زمان و مکان کے اعتبار سے ان خصوصیات کو ترتیب دیتا ہے۔ اس کے بعد جذبات، یادداشت، خیالات اور نتائج کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر گزشتہ تجربات کو آئندہ کے نتائج سے وابستہ کرتا ہے۔ آخر میں اس وابستگی کی مدد سے حالات کے مطابق افعال کا مظاہرہ کرتا ہے۔

انا کے سامنے پیچیدہ مسائل بھی آسکتے ہیں جن کے حل کرنے میں زیادہ مدت کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مسئلہ میں زندگی بھر الجھا رہے۔ ان حالات میں وہ مسلسل ایک انداز میں کام کرتا رہے۔ وہ گزشتہ واقعات کو خاص طور سے مدنظر رکھتا ہے۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انسان حالات کے تحت بدلتا رہتا ہے اس لیے مشاہدہ نفس اور مطالعہ باطن کی روشنی یا کسی انسان کے افعال کا جائزہ صداقت اور صحت کے ساتھ لینا دشوار ہے۔ لیکن سینٹ ٹامس نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مادی نقطۂ نظر سے انسان بدلتا رہتا ہے مگر فطری طور پر وہ یکساں رہتا ہے، اس لیے انسان کی فطرت تبدیل نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر مطالعہ باطن کے نتائج مجموعی طور پر صحیح ہوتے ہیں۔ برشین کا خیال ہے کہ عام طور سے انسان کی فطرت نہیں بدلتی ہے۔ لیکن نئی عادتوں کے پیدا ہونے سے انسان کی شخصیت بدل بھی سکتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ کچھ لوگ جزوی طور پر بدل جاتے ہیں اور کچھ لوگ کلی طور پر خود کو

تبدیل کر لیتے ہیں۔ عارضی تبدیلی کا رجحان اس وقت اور قوت حاصل کر لیتا ہے، جب عضویاتی عناصر میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جیسے کانوں میں بھنبھناہٹ۔ سماعت کی رگوں میں پانی کی پیدائش۔ دوران سر اور شراب کی کثرت سے انسان کی عادتوں میں وقتی طور پر تبدیلی واقع ہو سکتی ہے، اس خاص کیفیت کے دور ہونے کے بعد انسان پھر اپنی اصلی حالت میں آ سکتا ہے، مگر جب یادداشت ختم ہو جاتی ہے تو انسان کے کردار میں مستقل تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

ذات (SELF) کے سلسلہ میں جمیس کول مین (JAMES COLEMAN) کے خیالات بھی اہم ہیں۔ اس کا قول ہے کہ جب بچہ پروان چڑھتا ہے اور اپنی ذات اور کائنات کی دیگر اشیا میں تمیز کرنے لگتا ہے تو اس میں اپنی ذات یا انا کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہیں سے اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس لیے جب اس کے سامنے کوئی مسئلہ آتا ہے تو وہ اپنی ذات، ایغو اور شخصیت کی روشنی میں اس پر غور کرتا ہے۔

بچہ ذات اور کائنات کے تعلق کے سلسلہ میں کچھ مخصوص خیالات کی تشکیل کرتا ہے۔ اول تو اس کے سامنے حقیقی مفروضہ ہوتا ہے۔ اس اصول کے تحت وہ اشیا کی حقیقت، اپنی ذات اور کائنات کی نوعیت پر غور کرتا ہے۔ دوسری صورت میں اس کے سامنے اخلاقی مفروضہ ہوتا ہے۔ اس مفروضہ کی روشنی میں وہ سوچتا ہے کہ اشیا کو کس انداز کا ہونا چاہیے۔ ان کی صحیح یا غلط صورت کیا ہے۔ ان کے محاسن یا معائب کی نوعیت کیا ہے۔ تیسری شکل امکانی مفروضہ کی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اشیا میں تبدیلی کس طرح ممکن ہے اس کی ذاتی اور سماجی ترقی کے امکانات کیا ہیں۔ ان تمام عناصر کے امتزاج سے ایک بچے کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے اور اسی شخصیت کے خول سے خودداری ابھرتی ہے۔

ہم اس موقع پر عام انسانوں اور نیوراسس کے مریضوں کی خودداری پر غور کر سکتے ہیں۔ فرائڈ کا قول ہے کہ خودداری کا تعلق انا سے ہے، ہر چیز جو ہمارے قبضہ میں ہوتی ہے یا جس کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس میں قدرتِ کاملہ کے ابتدائی جذبہ کی تلچھٹ خودداری کی تعمیر کے سلسلہ میں مدد کرتی ہے۔ اگر ہم جنسی جبلت اور انانیتی جبلت کے

درمیان فرق کریں تو تو ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خودداری کا تعلق نرگسی قوت جنسی سے بہت زیادہ ہے۔ فرائڈ کا یہ بھی خیال ہے کہ پیرافرینا (Paraphrenia) کے مریضوں میں خودداری کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر منقول اعصابی خلل (Transference Nervoses) کے مریضوں میں یہ رجحان کم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ عاشق کی ذات میں بھی خودداری کے شعلے بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں مگر معشوق میں اس کی آنچ تیز ہوتی ہے۔ معشوق کی اطاعت کا جذبہ عاشق کی خودداری پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ دراصل عاشق ہمیشہ منکسر مزاج ہوتا ہے۔ محبت کرنے والا اپنی نرگسیت کے کچھ نہ کچھ اجزا کو فنا کر دیتا ہے اور یہ توقع کرتا ہے کہ اس کا معشوق اس کی محبت کا جواب دے اور اس طرح اس کی مجروح خودداری کی تلافی ہو جائے۔

جب کوئی شخص جسمانی کمزوری یا دماغی خلل کی بنا پر محبت میں نااہل ثابت ہوتا ہے تو اس کی خودداری پست ہو جاتی ہے۔ اسی لیے منقول اعصابی خلل کے مریضوں میں خودداری کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ دراصل احساس کمتری کا سبب انا کی کم مائیگی ہے کیوں کہ مریض انا سے زبردست جنسی قوت کو خارج کر دیتا ہے، اس لیے انا مجروح ہو جاتا ہے۔

فرائڈ کا نظریہ الفریڈ ایڈلر کے اصول تلافی (Compensation Principle) سے ہم آہنگ ہے۔ یعنی جب انسان اپنی ذات میں جسمانی خامی محسوس کرتا ہے اس وقت یہ خامی اس کے دماغ پر مہمیز کا کام کرتی ہے اور وہ نعم البدل کے طور پر بلند تر صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ہر بلند کامیابی کا راز جسمانی خامی میں مضمر ہے۔ سارے فن کاروں کی بینائی کمزور نہیں ہوتی اور نہ سارے مقرر لکنت کرتے ہیں، بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے جسمانی برتری کی بنا پر کامیابی حاصل کی ہے۔

دراصل طبی نقطہ نظر سے جسمانی خامی اور ناقص طبوخت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نیوراسس کا مریض ان خامیوں کو صلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مثلاً فرائڈ کا

قول ہے کہ ایک مریضہ کا یہ بیان ہے کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑ سکتی ہے کیوں کہ وہ بدشکل ہے۔ چوں کہ اس مریضہ میں کوئی کشش نہیں ہے اس لیے اس سے کوئی محبت نہیں کر سکتا ہے۔ مگر اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی مریضہ حسین ہو، پھر بھی جنسی تمناؤں سے بیزار ہو۔ زیادہ تر خوب صورت عورتیں ہسٹریا کی مریض ہوتی ہیں مگر پست طبقہ کی بدصورت عورتیں دماغی خلل کا شکار کم ہوتی ہیں۔

خودداری اور محبت کے تعلق کو سمجھنے کے لیے دو کیفیات کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ پہلی صورت میں انا کامیاب نظر آتا ہے۔ دوسری صورت میں جنسی جذبات کا انسداد ہو جاتا ہے۔ محبت جب تمنا اور ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے تو خودداری مجروح ہو جاتی ہے۔ مگر جب انسان محبت کا جواب بھی پاتا ہے اور محبوب بھی اس سے اظہارِ محبت کرتا ہے تو خودداری کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جب جنسی قوت دب جاتی ہے تو عشقیہ جذبات پامال ہو جاتے ہیں۔ اس وقت محبت مطمئن نظر نہیں آتی۔ انا کا سرمایہ اسی وقت واپس آسکتا ہے جب وہ خارجی شئے سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ ایسی صورت میں نرگسیت ابھرتی ہے۔

خودداری کے بارے میں ولیم مکڈوگل نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ تمام احساسات میں خودداری کا احساس بہت اہم ہے۔ خودداری کے سلسلہ میں خود شناسی (Self consciousness) کے متعلق بھی اظہار خیال ضروری ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ مختلف اشیا پر اعتقاد ہماری کوشش اور ہمارے حصول پر منحصر ہے۔ جب کوئی شخص حصولِ مقصد کے لیے کوشش کرتا ہے تو وہ مسرت بھی حاصل کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ آلام میں بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ بہت سی چیزوں کو حافظہ میں محفوظ رکھتا ہے اور مستقبل سے توقعات وابستہ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنے بارے میں سوچتا بھی رہتا ہے یہی خود شناسی کی علامت ہے[1]

---

[1] An outline of Psychology by Mcdougall P. 426.

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک بچے کا احساس بہت دھندلا ہوتا ہے۔ لیکن جب اس میں قوتِ گویائی پیدا ہو جاتی ہے تو زبان اس کے احساس میں مدد کرتی ہے۔ جب اس کو اس کے نام سے پکارا جاتا ہے تو وہ اپنے بارے میں محسوس کرتا ہے۔ اپنی ذات کا نمائندہ بن کر اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے کھلونوں کے بارے میں معلومات رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو اپنے اعضا اور دیگر اجزائے جسمانی کا بھی علم ہوتا ہے۔ دراصل ان چیزوں سے اس کی خوشی اور غم وابستہ ہو جاتا ہے۔

بچے کی ذات سے دیگر افراد بھی دل چسپی لیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اس کی پرورش اور نگہداشت کرتے ہیں۔ جب وہ ان افراد سے توقع، یادداشت، اطاعت، اقرار اور انکار کے جذبات وابستہ کرتا ہے تو اس کو اپنی ذات کے بارے میں زیادہ علم ہوتا ہے۔ یہی لوگ اس کے لیے انعام کا ذریعہ بنتے ہیں، اور کبھی اس کو سزا کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ اس کی مدح سرائی کرتے ہیں، اور پھر اس کو موردِ الزام بھی ٹھہراتے ہیں۔ اس کے بارے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس پر کبھی ستائش کے پھول برساتے ہیں اور کبھی نفرت کے شعلوں سے اس کی روح کو جھلسا دیتے ہیں۔ اس کو لعنت کے تیروں سے مجروح کرتے ہیں اور طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ ان باتوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ کبھی وہ اپنا سر بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی وہ اپنا سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے۔ کیوں کہ اس کے . . . . . اندر سر بلندی اور اطاعت کی جبلتیں فطری طور پر موجود ہیں۔ اس طرح اس کے دل میں جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اپنی کمزوریوں اور قوتوں کو بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کو اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے خاص رجحانات سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ منزل آجاتی ہے جب وہ اپنے متعلق دوسروں کے خیالات کو شدید طور پر محسوس کرتا ہے۔ دوسروں کے خیالات سے اس کو سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ الجھن میں بھی گرفتار ہوتا ہے۔ جب اس کو اپنی ستائش سے مسرت حاصل ہوتی ہے تو اس کی کامرانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کی خدمت کی جاتی

ہے تو اس کو اپنی ناکامیوں کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔

جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی پسندیدگی یا اخلاقی ناپسندیدگی اس کے نظریات کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے متعلق اسی قسم کے نظریات ساری جماعت اور ساری دنیا کے ہیں۔ اس کو یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ دنیا میں کسی فرد کو خیر و شر کے روایتی معیار سے جانچا جاتا ہے اور اسی کی روشنی میں اس کو جزا یا سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ آخر کار وہ اپنے اخلاقی معلموں اور نکتہ چینیوں کے خیالات کی روشنی میں اپنے متعلق ایک نظریہ قائم کر لیتا ہے اور یہیں سے اس کا انا بیدار ہو جاتا ہے[۱]۔ انانیت کا رجحان اس کے دماغ میں بہت سی پیچیدگیوں کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اس انانیت کا احساس گزشتہ واقعات اور روداد کی روشنی میں زمان و مکان کے روابط کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے۔ اس کی ارادی اور جبلاتی ذہنیت علائق عالم کے سلسلہ میں بہت نازک موڑ اختیار کر لیتی ہے اور یہیں سے خودداری کا احساس جنم لیتا ہے۔

خودداری کے احساسات جب اپنا دامن پھیلاتے ہیں تو ان میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ انسان کے جسمانی اور ذہنی حدود کو پار کر جاتے ہیں۔ مثلاً انسان کا لباس جو اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، دوسروں کی تنقیدات کا تابع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی تعریف، پسندیدگی اور مزاج کا اثر ایک شخص کے لباس پر پڑتا ہے۔ جب اس لباس کی لوگ تعریف کرتے ہیں تو اس کا دل مسرت سے شگفتہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں تو وہ آزردہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایک انسان کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے اشخاص کی تنقیدات کا لحاظ رکھے۔

اسی طرح سے مکان، تصویر، کتاب اور کمرے کی آرائش دوسرے لوگوں کی تحسین و تعریف کے تابع ہے۔ یہاں تک کہ ہماری ساری املاک دوسروں کے نظریات کی

---

1. An outline of Psychology by Mcdougall P. 427

محتاج ہے۔ اسی لیے ہماری خودداری ان نظریات کا احساس و احترام کرتی ہے اور دوسروں کی تنقیدات سے گریزاں نہیں ہو سکتی ہے۔

خودداری کا احساس زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہے۔ مثلاً خاندان، اسکول، کالج، شہر اور قوم سے بھی خودداری کی وابستگی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان اداروں کے متعلق ایک شخص اپنے مخصوص نظریات قائم کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان اداروں کے نظریات کے مطابق وہ خود کو بھی ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً ایک انسان اپنے بچوں کے ساتھ جذبۂ ایثار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی وہ اپنی خودداری سے کام لیتا ہے۔ ایک بچہ اپنے باپ کے خیالات و جذبات کی نمایندگی کرتا ہے۔ اس لیے اگر لوگ اس بچے کی ستائش کرتے ہیں تو باپ خوش ہوتا ہے۔ اور اگر اس کی مذمت کی جاتی ہے تو باپ کو صدمہ پہونچتا ہے۔

دراصل خودداری اور اس کی ساری پیچیدگیاں، خود داعائی اور فروتنی کے جذبات کے ساتھ ایک نوجوان کی زندگی میں بہت اہمیت اور شدت اختیار کر لیتی ہیں یہ جذبات ہماری شخصیت پر چھا جاتے ہیں۔ یہ جذبات ہماری مسرت اور ہمارے غم کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ دراصل سماجی تذلیل ہمارے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اور سماجی اعزاز ہماری زندگی کو فروغ بخشتا ہے۔ یہ خودداری کا کرشمہ ہے کہ قدیم عہد میں بہت سے غلاموں نے خودکشی کر لی ہے، اور بہت سے معزز اشخاص نے بے حرمتی کی بنا پر اپنی جان دے دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے لوگوں نے اپنی عزت اور خودداری کی حفاظت کے لیے اپنا مال و متاع قربان کر دیا ہے۔ جب خودداری کو ٹھیس لگتی ہے تو انتقام کا جذبہ بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ غرض کہ خودداری انسان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے جس کے گرد اس کی ساری شخصیت گردش کرتی ہے۔

خودداری کی نمود کا ایک اور بھی سبب ہے جس کی طرف کارل یونگ (CARL JUNG) نے اشارہ کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ انسان کی غیر شعوری سطح کے نیچے اس کے ماضی کی باقیات کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے بچپن کی بہت سی باتوں کو ذہنی تہوں کے اندر

غیر شعوری طور پر محفوظ رکھتا ہے یہی نہیں بلکہ اس کی ذات پر اس کے نسلی اثرات بھی ثبت ہو جاتے ہیں[۱] اور یہی اثرات خودداری کے جذبات کی تعمیر کرتے ہیں۔

خودداری کے نمونے تقریباً دنیا کے ہر ادب میں ملتے ہیں۔ چنانچہ بائرن کی شاعری میں خودداری کی بے بہا مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک لاجواب نظم Childe Harold's Pilgrimage ہے۔ اس نظم میں اس نے اپنے یورپ میں سفر کا ذکر کیا اور اسپین۔ یونان۔ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی وغیرہ کے فطری مناظر کے حسن کی عکاسی کی ہے۔ مناظر فطرت کے بیان کے علاوہ اس نے ان ملکوں کی ایسی عظیم شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے جادۂ ہستی پر دائمی نقش چھوڑے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی شخصیت کے خط و خال کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ایک جگہ اس نے اپنی خودداری کا اظہار بھرپور طریقے پر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

I have not loved the world, nor the world
me;
I have not flattered its rank breath, nor
bowed
To its idolatries a patient knee,
Nor coined my cheek to smiles — nor cried
aloud
In worship of an echo; in the crowd
They could not deem me one of such — I
stood
Among them, but not of them — in a
shroud

---

[۱] The Theory of Literature by Rene Wellek and Austin Warren
P. 84

of thoughts which were not their thoughts,
and still could,
Had I not filed my mind, which thus itself
subdued.

بائرن کا قول ہے کہ میں نے دنیا سے محبت نہیں کی ہے اور نہ دنیا نے مجھ سے محبت کی ہے۔ میں نے اس کی بوُ دار سانس کی کبھی خوشامد نہیں کی، اور نہ اس کے پرستاروں کے سامنے کبھی سر خم کیا۔ میں نے کبھی پُر تصنع ہنسی کا اظہار نہیں کیا اور نہ کبھی کسی آواز بازگشت کی ہم نوائی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ہجوم دنیا ہی میں رہتا ہوں، مگر ذہنی اعتبار سے اہلِ دنیا سے جدا ہوں۔ میں ان کے درمیان کھڑا ہوں، مگر وہ خیالات کے جس کفن میں ملفوف ہیں، میں ان سے باہر ہوں۔ میں نے کبھی اپنے دماغ کو ناپاک نہیں کیا اور نہ کبھی کسی سے مرعوب ہو کر اطاعت قبول کی۔

بائرن کے یہ خیالات اس کی خودداری پر روشنی ڈالتے ہیں اس لحاظ سے ہم اس کو ایک نرگسی شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

سنسکرت ادب میں بھی خودداری کی جھلک موجود ہے۔ شاہ جہاں کے دربار میں ایک شاعر پنڈت راج جگناتھ تھے۔ ان کو مختلف علوم پر عبور حاصل تھا، ان کا اصل نام جگناتھ تھا، مگر شاہ جہاں نے ان کو پنڈت راج کا خطاب عطا کیا تھا۔

پنڈت راج نے اپنی تصنیف "رس گنگا دھر" میں لکھا ہے:

निर्माय नूतनमुदाहरणानुरूप
काव्य मयान्न निहित पहस्य किंचित् ।
कि सेव्यते सुमनसा मनसापि गन्ध
कास्तूरिकाजन नशक्तिभृता मृगेण ॥

پنڈت راج جگناتھ کہتے ہیں کہ میں نے ساری مثالیں خود ہی بنا کر پیش کی ہیں کیونکہ کستوری

British poetry and Prose. Childe Harold's pilgrimage stanza
113. P. 139

کو پیدا کرنے کی قوت رکھنے والا کہیں معمولی پھولوں کی خوشبو برداشت کر سکتا ہے۔

ہندی شاعری بھی خودداری کی تابناکی سے عاری نہیں ہے۔ مثلاً ریت کال کے شاعر ٹھاکر بندیلکھنڈی کے یہاں خودداری کا رجحان موجود ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر اپنی خودداری کا اظہار بہت جرأت کے ساتھ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ راجا بہت بہادر کبھی انگریزوں کی موافقت میں لڑتے تھے اور کبھی لکھنؤ کے نواب کی طرفداری کرتے تھے، اس لیے ان کا کردار بہت کمزور تھا۔ ایک بار انھوں نے راجا پرجھت کو فریب دے کر باندہ بلانا چاہا، مگر ٹھاکر راستے میں مل گئے اور انھوں نے کچھ ایسا اپنا کلام سُنایا کہ راجہ پرجھت واپس ہو گئے۔ جب راجہ بہت بہادر کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے ٹھاکر کو طلب کیا اور ان پر غصہ کا اظہار کیا۔ ٹھاکر کی خودداری نے اپنی توہین برداشت نہیں کی۔ انھوں نے میان سے تلوار نکال لی اور یہ اشعار پڑھے:

सेवक सिपाही हम, उन राजपूतन के,
दान जुद्ध जुरिबे में नेकु जे न मुरके।
नाति दे नवार हैं महो के महिपालन को,
हिए के विसुद्ध हैं, सनेही साँचे उर के॥
ठाकुर कहत हम बैरी बेवकूफन के,
जालिम दामाद हैं अदानियाँ ससुर के।
चोजिन के चोजिन महा, मौजिन के महराज,
हम कविराज हैं, पै चाकर चतुर के॥[۱]

عربی ادب میں خودداری کی بہت کافی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ چوں کہ عربوں کو اپنی ذات کا عرفان تھا اس لیے وہ اپنی ذلت برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ہر موقع پر خودداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ چہارم میں عربی شاعر عمرو بن کلثوم کی خودداری کا ایک واقعہ پیش کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ عرب میں ایک مشہور بادشاہ عمرو بن ہند گزرا ہے۔ اس کی جاہ و حشمت کا چاروں طرف شہرہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے زعم میں

۱۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ پنڈت رام چندر شکل 383ء

آکر درباریوں سے کہا:

"کیا عرب میں کوئی ایسا شخص ہے جس کو میرے سامنے گردن جھکانے سے عار ہو"

درباریوں نے جواب میں عمرو بن کلثوم کا نام لیا جو قبیلہ تغلب کا مشہور شاعر تھا۔ بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کو مع مستورات کے مدعو کیا۔ یہ قبیلہ وقت متعینہ پر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ عمرو بن کلثوم دربار میں بیٹھ گیا اور عورتیں شاہی حرم میں داخل ہو گئیں۔ بادشاہ کی والدہ نے عمرو بن کلثوم کی ماں سے کسی چیز کو اُٹھانے کے لیے کہا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "آدمی کو اپنا کام آپ کرنا چاہیے"۔ بادشاہ کی ماں کو اس کی یہ گستاخی پسند نہیں آئی اس لیے اس نے دوبارہ عمرو بن کلثوم کی ماں کو اسی چیز کو اُٹھانے کے لیے حکم دیا۔ اب عمرو بن کلثوم کی ماں سمجھ گئی کہ ملکہ اس کو پست سمجھتی ہے اسی لیے وہ اس قسم کے حکم کی تعمیل چاہتی ہے۔ چناں چہ اب کی بار اس نے چیخ کر پکارا" واتغلباہ واذلاہ" (ہائے تغلب کی ذلت) عمرو بن کلثوم کے کانوں میں اس کی ماں کی صدا پہونچی۔ وہ طیش میں آ گیا اور دربار ہی میں بادشاہ کا سر اس کی گردن سے اُڑا دیا اور خود دربار سے فرار ہو گیا۔ اس واقعہ کے نتیجہ میں طرفین میں جنگ چھڑ گئی اور ہزاروں کا خون بہہ گیا۔ عمرو بن کلثوم نے یہ سارے واقعات اپنے ایک قصیدے میں پیش کئے اور عکاظ کے میلہ میں اس قصیدے کو سنایا۔ یہ قصیدہ اتنا مشہور ہوا کہ قبیلہ تغلب کے بچوں کو زبانی یاد ہو گیا۔ اور یہ قصیدہ دو سو برس تک اس خاندان کے افراد میں جوش و خروش پیدا کرتا رہا۔ یہ قصیدہ سنہرے حروف میں لکھ کر در کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔ اب اس قصیدے کا شمار سبعہ معلقہ میں کیا جاتا ہے۔

اس مشہور قصیدے کے چند اشعار مولانا شبلی نے شعر العجم میں پیش کئے ہیں، جو یہ ہیں:-

ابا هند فلا تعجل علینا	وأنظرنا نخبرك الیقینا
(اے ابو ہند! جلدی نہ کر	ہم تجھ کو سچے واقعات بتاتے ہیں)

بانا نورد الرّایات بیضا	ونعید ھنّ حمرًا قد ادنیا
(ہم معرکۂ جنگ میں سفید جھنڈے لیکر جاتے ہیں	اور ان کو سُرخ کر کے لاتے ہیں)
الا لا یجھلن احدٌ علینا	فنجھل فوق جھل الجاھلینا
(ہاں ہم سے کوئی جہالت نہ کیے ورنہ ہم	جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کریں گے)
اذا بلغ الفطام لنا جبیٌّ	تخرّ لہ الجبابر ساجدینا
(ہماری قوم کا بچہ جب دودھ چھوڑتا ہے	تو بڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں) [1]

عرب شعرا کا کردار ہمیشہ خود داری کا رہا ہے یہی کردار ہم کو دور جدید کے شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ جب ۱۸۸۱ء میں اعرابی پاشا نے انگریزوں سے بغاوت کی، تو عربی شاعری میں خودداری کے رجحانات مکمل طور سے اُبھر آئے۔ چناں چہ مصطفےٰ کمال نے اپنی خود داری کا اظہار اس طرح کیا ہے:

الیس یُشینا ترلک المعالی	تباع لغیر دادینا وتشتری

(کیا یہ عیب کی بات نہیں کہ بلندیوں کی خرید و فروخت ہمارے ملک سے باہر ہو)

وعارٌ ان یکون لنا وجود	ویحظی غیرنا فوزا ونصرا

(ہمارا وجود ہمارے لیے باعثِ عار ہے کہ غیر کامیابی و نصرت حاصل کریں اور ہم محروم رہیں) [2]

فارسی ادب میں تو خودداری کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔ چناں عرفیؔ کی خود داری فارسی شاعری میں مثالی ہے۔ اس کی خودداری کے بارے میں ملا عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی میں لکھا ہے:

"الحق ہیچ شاعرے را این رتبہ و منزلت و حالت در ملازمت بادشاہانِ زمان و اکابر دوراں بہم نہ رسیدہ بود کہ او را بہم رسیدہ بود، چناں چہ در ایام ملازمت کورنش و تسلیم بہ صاحب خود نہ کردہ و بہر طور

---

[1] شعر العجم۔ حصہ پنجم۔ مولانا شبلی ص۲۶ تا ۲۸

[2] عربی شاعری کے جدید رجحانات۔ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی۔ ص۱۰۱

درروئے گرمی خواستہ در مجالس می نشستہ واہل عالم تقدیم ادراتبون می نمودہ اند۔ واززخارف دنیوی بدولت ایں سرور صاحب ہمتان بے نیاز بودہ" [۱]

ملا عبدالباقی نہاوندی نے عرفی تخلص اختیار کرنے کا سبب بھی لکھا ہے:

"وسبب عرفی تخلص نمودن ایں دانشور آنست کہ چون پدرش بعضے اوقات در دیوان حکام فارس بہ امور وزارت داروغۂ دارالافاضل شیراز مشغول می نمود، مناسبت شرعی وعرفی را منظور داشتہ، عرفی تخلص کرد" [۲]

عرفی کی خودداری کا سبب اس کا اعلیٰ ماحول تھا۔ اس کا باپ شیراز کی وزارت میں ملازم تھا۔ اس بنا پر عرفی نے اپنی آنکھوں سے اعلیٰ ماحول دیکھا تھا۔ چونکہ ایران میں غیر مذہبی حکموں کو عرف کہتے تھے اس لیے اس نے عرفی تخلص اختیار کیا۔ اس تخلص کا اس کی شخصیت پر بھی اثر پڑا۔ چناں چہ اس کے مزاج میں خودداری داخل ہوگئی۔

ایران کے شعرا زیادہ تر معمولی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً خاقانی بڑھئی تھا۔ فردوسی باغبان تھا۔ مگر عرفی کا باپ ایرانی حکومت میں ایک مرتبہ رکھتا تھا اس لیے عرفی میں خودداری کے جراثیم پیدا ہوگئے تھے۔ چناں چہ عرفی کہتا ہے:

تحفۂ برہم نہ گیرد سینۂ افگار ما	سایۂ گل بر نتابد گوشۂ دستار ما
آتش افروز تب عجزیم و کس ہرگز ندید	جوش تبخال شفاعت بر لب زنہار ما
کفران نعمت گلہ مندان بے ادب	در کیش من ز شکر گدایانہ خوشتر است

طالب آملی میں بھی خودداری کی آب و تاب موجود تھی۔ جہانگیر نے ایک بار نشے کے عالم میں حکم دیا کہ سارے درباری داڑھی منڈا کر دربار میں آئیں۔ طالب آملی نے اس حکم

---

[۱] ماثر رحیمی۔ ملا عبدالباقی نہاوندی جلد سوم ص ۲۹۶ ۲۹۱

[۲] ″ ″ ″ ″ ص ۲۹۵

کی تعمیل نہیں کی اور اپنے گھر بیٹھ رہا۔ اس کے بعد اس نے قطعہ لکھ کر بادشاہ کے حضور میں روانہ کیا اور غیر حاضری کی معذرت پیش کی۔

تراشید گانند یک سر سپاہ	کسے را چو من سترہ پر کاہ نیست
بہ بزمے کہ موئے نہ گنجد درد	شدن باد و گرزیش دل خواہ نیست
بہشت است بزم تو و در بہشت	من ناتراشیدہ را راہ نیست

غرضیکہ فارسی شاعری میں خودداری کے جلوے جا بجا نظر آتے ہیں۔ چوں کہ اردو شاعری فارسی شاعری سے اثر پذیر ہوئی ہے' اس لیے اُردو شاعری میں بھی خودداری کی آب و تاب پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے بعض شعرا کے یہاں بھی خودداری رسمی طور پر ملتی ہے۔ لیکن ایسے شاعروں کی بھی تعداد کافی ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں خودداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لیے جب ان کی شاعری میں ہم کو خودداری کی آنچ نظر آتی ہے تو یہ انھیں کے دل کے انگاروں کا عکس ہوتا ہے۔ اس قسم کی خودداری رسمی کے بجائے حقیقی ہوتی ہے۔ اب آیندہ کے صفحات میں اُردو شاعری میں خودداری کے جذبات کو پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ حاتم

۱۱۱۱ھ — ۱۱۹۶ھ

شاہ حاتم کی شخصیت اور شاعری میں خودداری شعلۂ شبنم کی طرح جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حاتم کے والد شیخ فتح الدین ایک سپاہی پیشہ انسان تھے۔ اس لیے حاتم کی تربیت بھی فن سپہ گری کے مطابق ہوئی۔ حاتم نواب عمدۃ الملک امیر خاں صوبہ دار الہ آباد کے مطبخ کے داروغہ تھے۔ اس کے علاوہ ہدایت علی خاں، مراد علی خاں اور فاخر خاں وغیرہ کے یہاں بھی وہ ملازم رہے۔ اس لیے ان کی ابتدائی زندگی عیش و عشرت کے ساتھ گزری مگر ان کی بعد کی زندگی پُر آشوب رہی۔

محمد شاہ کے دور میں جب مغلیہ حکومت کمزور ہو گئی تو بہت سے خوددار لوگوں نے

ملازمت ترک کر دی اور قناعت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ چناں چہ حاتم بھی میر بادل علی شاہ کے تکیہ سے وابستہ ہو گئے۔ اور ان کی مریدی اختیار کر لی۔ حاتم نے ان شاہ صاحب کی عقیدت میں ایک شعر بھی کہا ہے

خودی کو چھوڑ حاتم خدا دیکھ   کہ تیرا رہنما ہے شاہ بادل[1]

حاتم کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ خوشامد خلق کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ ایک شعر میں تو حاتم نے دولت مندوں کے وجود ہی سے انکار کر دیا ہے، ان کی خوشامد کا کیا سوال؟

فقر کے کشور کی حق نے دی ہے مجھ کو سلطنت   صاحبِ دولت کو کب موجود کر بوجھوں ہوں میں

حاتم نے ایک اور شعر میں خودداری کا اظہار کیا ہے:

اگر حاتم جہاں میں مفلس و بے ساز و ساماں ہو   ولے مسند نشیں صحبت مسند نشیناں ہے

حاتم کی نظر میں منصب و جاگیر کی وقعت نہیں ہے:

دام سے منصب و جاگیر کے باز آ حاتم   یہ دمِ نقد نہ کھو فکر محالات کے بیچ

حاتم کی خودداری کی شان دیکھیے:

مفلسی اور دماغ اے حاتم   کیا قیامت کرے جو دولت ہو

حاتم کا مندرجہ ذیل شعر ان کی خودداری کے بانکپن کو واضح کرتا ہے:

گھر کیا ہے ہم نے حاتم بہ سرِ دارِ فنا   بھاڑ میں ڈالیں گے لے کر منصب و املاک ہم

حاتم کے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی خودداری کے سائے نظر آتے ہیں:

آشنا حاتم غریبوں کا ہو، امراؤں کو دیکھ
نام کو ذرہ نہیں ہے ان بچاروں کو دماغ

مجھے دیوان خانہ سے کسی منعم کے کیا مطلب
کہ آزادی کی کر رہے کو بس تکیہ فقیروں کا

---

[1] سرگزشت حاتم۔ ڈاکٹر زور۔ ص ۳۵

حاتم کی مندرجہ ذیل رباعی بھی ان کی خودداری کا آئینہ ہے:

یک ذرہ کبھو نہ کام آئی مجھ کو
دولت مندوں کی آشنائی مجھ کو
گو فائدہ ان سے ہو نہ ہو حاتم ہوں
یکساں ہے شاہی و گدائی مجھ کو

غرضیکہ حاتم کی شخصیت اور شاعری میں خودداری کی خوشگوار اور روح افزا مثالیں نظر آتی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو ایک نرگسی شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

خواجہ میر درد

۱۱۳۳ھ — ۱۱۹۹ھ

خواجہ میر درد کے کلام میں خودداری کی کافی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شخصیت اعلیٰ محاسن کی حامل تھی۔ ماں کی طرف سے ان کا تعلق خواجہ بہاء الدین نقشبندی تک پہونچتا ہے۔ ان کے والد بھی ایک بزرگ صوفی تھے جن کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور عندلیب تخلص کرتے تھے، وہ شاہ گلشن سے عقیدت رکھتے تھے۔ خواجہ میر درد کا خاندان پیری مریدی کے لحاظ سے دلی میں بہت ممتاز تھا۔ اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان خصوصیات کی وجہ سے خواجہ میر درد میں خودداری کا جذبہ پیدا ہو گیا ہوگا۔

اس کے علاوہ خواجہ میر درد علوم رسمیہ پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے ان کو زبان اردو کے چار رکنوں میں شمار کیا ہے۔ درد میں خودداری کی نمود کا یہ بھی سبب ہو سکتا ہے۔

خواجہ میر درد کو موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس دور کے مشہور گویے ان کو اپنی موسیقی اصلاح کی خاطر سنایا کرتے تھے۔ یہ فنی بلندی بھی خواجہ میر درد کی خودداری کا سبب بن سکتی ہے۔

خواجہ میر درد کی زندگی کے واقعات بھی اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ وہ حد درجہ خوددار واقع ہوئے تھے۔ ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ شاہ عالم بادشاہ نے ان کی

محفل میں آنے کی خواہش ظاہر کی، مگر انھوں نے منظور نہیں کیا۔ درد کے یہاں ماہانہ اہلِ تصوف کا جلسہ ہوتا تھا، ایک بار بادشاہ بغیر اطلاع کے ان کی محفل میں آ گئے۔ اس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا اس لیے انھوں نے پاؤں پھیلا لیا۔ یہ بات درد کو ناگوار معلوم ہوئی۔ انھوں نے فرمایا: "یہ فقیر کے آدابِ محفل کے خلاف ہے"۔

بادشاہ نے جواب دیا۔ "معاف کیجیے عارضہ سے معذور ہوں"۔

درد نے کہا کہ "عارضہ تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی"۔ [1]

یہ واقعہ واضح طور پر خواجہ میر درد کی خود داری کی غمازی کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو ان کی خودداری کو ثابت کرتے ہیں

خواجہ میر درد نے مندرجہ ذیل شعر میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ کسی کا احسان نہیں اُٹھاتے ہیں، اور ثبوت میں یہ مثال پیش کی ہے کہ سرو کا درخت کبھی پھل کا احسان نہیں لیتا ہے۔

آزاد کسی کی بھی اُٹھاتے نہیں منت　　　دیکھا نہ کسو سرو کو تہ بارِ ثمر کا

یہ شعر نہایت حسن و خوبی کے ساتھ درد کی خودداری کو واضح کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں انھوں نے بتوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔

میں کس طرح بتوں کے سر سامنے جھکاؤں　　　دل تو دماغ اپنا کھینچے ہے آسماں پر

درد کی خودداری کا لب و لہجہ اس شعر میں بھی بہت تیکھا ہے:

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری　　　واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

خواجہ میر درد کی خودداری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں نرگسی رجحان کی جھلک موجود تھی۔ مگر یہ نرگسی رجحان نہایت صالح اور صحت مند ہو۔ اس پر مریضانہ ذہنیت کا انطباق نہیں ہو سکتا ہے۔

---

[1] آبِ حیات، مولوی محمد حسین آزاد۔ ص ۲۲۷، ۲۲۸

فغاں

پیدائش درمیان ۱۱۳۹ھ و ۱۱۴۱ھ۔ وفات ۱۱۸۶ھ

فغاں کی شاعری میں جابجا خودداری کے پرتو نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ فغاں احمد شاہ بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے۔ ان کے خاندان کو دنیاوی وجاہت و جاہ و حشمت حاصل تھی۔ اشرف علی خاں فغاں کی ماں نے بادشاہ احمد شاہ کو دودھ پلایا تھا۔ اسی بنا پر ان کو کوکہ، کوکہ خاں، کو کلتاش یا کوکلتاش خاں بہادر کہا جاتا تھا۔ ان کے چچا کا نام ایرج خان تھا جو مرشد آباد کے حاکم تھے۔ چوں کہ فغاں ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان میں خودداری کا پیدا ہو جانا فطری تھا۔

فغاں نے اپنا بچپن احمد شاہ کے ساتھ گزارا۔ جب احمد شاہ بادشاہ ہوئے تو فغاں ان کے ندیم خاص بن گئے۔ کوکہ ہونے کے علاوہ فغاں نہایت بذلہ سنج انسان تھے۔ اس بنا پر بھی وہ احمد شاہ کو بہت عزیز تھے۔ غرضیکہ فغاں کا شمار اعلیٰ درباریوں میں ہوتا تھا۔ وہ پنج ہزاری کے منصب پر فائز تھے۔ دربار تیموری سے ان کو ظریف الملک مصاحب الدولہ اور یکہ تاز جنگ کے خطابات بھی عطا ہوئے تھے۔ ان تمام اسباب کی بنا پر فغاں میں خودداری کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

فغاں نے اپنی خودداری کا اظہار اپنی زندگی میں مختلف مواقع پر کیا ہے۔ جب احمد شاہ بادشاہ کو قید کر دیا گیا تو فغاں دلّی کو خیرباد کہہ کر مرشد آباد میں اپنے چچا ایرج خاں کے یہاں پہنچے، لیکن وہاں زیادہ دن قیام نہ کر سکے، غالباً چچا کی کوئی بات ناگوار گزری ہوگی۔ اس لیے پھر دلی واپس آگئے۔ اس کے بعد فغاں نے اودھ کی طرف رُخ کیا اور نواب شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ چوں کہ فغاں کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا اس لیے نواب شجاع الدولہ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں بہت بے تکلفی بڑھ گئی مگر بعد میں رنجش پیدا ہو گئی۔ اس کا سبب مصحفی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ودرہما نزدے روزے نواب وزیر دستش داد در عالم اختلاط بہ

فلس سوختند۔ آب در دیدہ گردانید و ہیچ نگفت و آخر بریں حرکت آزدہ شد بطرف عظیم آباد رفت"۔ [1]

بہرحال اس کے بعد فغاں عظیم آباد چلے گئے۔ یہاں راجہ شتاب رائے کی ملازمت اختیار کی۔ چوں کہ راجہ شتاب رائے دربار مغلیہ کے نمک خوار تھے، اس لیے انھوں نے فغاں کے ساتھ وفاداری کا دم بھرا، اور ان کی مکمل طور پر تعظیم و تکریم کی۔ اب فغاں عظیم آباد میں چین کی زندگی بسر کرنے لگے۔

فغاں کی نازک مزاجی نے ان کو عظیم آباد میں بھی چین نہ لینے دیا۔ ایک روز راجہ شتاب رائے نے فغاں سے احمد شاہ ابدالی کے حملے کا حال پوچھا۔ راجا صاحب نے بطور طنز یا ازراہ سادہ لوحی فغاں سے پوچھا:

"نواب صاحب ملکہ زمانی کو احمد شاہ درانی کیوں کرلے گیا؟"

فغاں کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اور انھوں نے افسردگی سے جواب دیا:

"مہاراج جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا"

اس کے بعد فغاں نے دربار جانا چھوڑ دیا۔ ان سب واقعات سے فغاں کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں بھی خودداری کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کروں اس بیوفا کی میں کہاں تک اے فغاں منت	نہ سمجھے ہے نہ بوجھے ہے نہ جانے ہے نہ مانے ہے
اٹھا سکتا نہیں میرا یہ جسم ناتواں منت	برنگ نقش پا فارغ ہوں چشم دستگیری سے

فغاں محبوب کی منت سے عاجز آگئے ہیں اور اب ان میں منت و سماجت کا دم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کا جسم ناتواں بھی منت اٹھانے سے معذور ہے۔ غرضیکہ فغاں کے کلام میں خودداری کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں مکمل طور پر نرگسی رجحان موجود تھا۔

---

[1] تذکرۂ ہندی مصحفی۔ صفحہ ۱۶۰

سودا

۱۱۱۸ھ — ۱۱۹۵ھ

مرزا محمد رفیع سودا کی شاعری میں خودداری کی جھلکیاں آئینہ کی طرح روشن ہیں۔ سودا کی خودداری کا تعلق ان کے اعلیٰ ماحول اور خاندان سے تھا۔ ان کے بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا جن کا شمار کابل کے اعلیٰ میرزا لوگوں میں ہوتا تھا۔ سودا کے والد مرزا محمد شفیع صاحب نے سپہ گری کا پیشہ ترک کر کے سوداگری شروع کی اور اس سلسلے میں ہندوستان میں وارد ہوئے، اور پھر یہیں کے باشندے ہوگئے۔ سودا کے یہاں خودداری ان کی اعلیٰ نسبی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

سودا کی خودداری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کے مستند اُستادِ سخن تھے۔ دلّی کے گلی کوچوں میں ان کی شاعری کی دھوم تھی۔ حاتم جیسے بزرگ اور صاحبِ فن شاعر کو ناز تھا کہ سودا ان کے شاگرد رہے ہیں۔ اس بے پناہ شہرت نے بھی ان کو خوددار بنا دیا تھا۔

سودا نے اپنی خودداری کا اظہار اپنی زندگی میں کئی بار کیا ہے۔ جب ان کی شہرت آگ کے شعلوں کی طرح گلشنِ دلّی میں پھیلنے لگی تو شاہ عالم بادشاہ نے ان کو اپنا اُستاد بنا لیا۔ اس طرح سودا شاہی دربار سے منسلک ہوگئے۔ شاہ عالم کبھی کبھی سودا سے کوئی تازہ غزل سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ ایک بار بادشاہ نے کسی غزل کے لیے سودا سے تقاضا کیا۔ انھوں نے معذرت چاہی۔ بادشاہ نے پوچھا "بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟"

مرزا نے جواب دیا:— "پیر و مرشد! جب طبیعت لگ جاتی ہے، دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔"

بادشاہ نے فرمایا "بھئی ہم تو پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔"
تب سودا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضور ویسی بو بھی آتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے گھر

چلے آئے اور دوبارہ دربار نہیں گئے۔ بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ تم ہماری غزلیں بنا دیا کرو، ہم تم کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کریں گے۔ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا۔" [۱]

رفتہ رفتہ سودا کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ ان کا نام نواب شجاع الدولہ کے دربار تک پہنچا اور انھوں نے ایک خط "برادرِ من مشفق مہربان" لکھ کر بھیجا، اور ساتھ ہی سفر خرچ بھی روانہ کیا تاکہ وہ لکھنؤ چلے آئیں، مگر اس کے جواب میں سودا نے مندرجہ ذیل رباعی لکھ کر روانہ کر دی:

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک | آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے | بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

اس واقعہ سے بھی سودا کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔

کئی سال کے بعد سودا کے قدردان انتقال کر گئے اور اب ان کو فکرِ معاش دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ وہ فرخ آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور نواب شجاع الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد نواب صاحب نے بے تکلفی کے طور پر یا طنزیہ انداز میں سودا سے کہا کہ "مرزا وہ رباعی تمھاری اب تک میرے دل پر نقش ہے"۔ پھر نواب صاحب نے اس رباعی کو پڑھا۔ سودا کو اس سے روحانی تکلیف پہنچی، اور اس کے بعد وہ دربار نہیں گئے۔ یہاں تک کہ نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔[۲]

سودا کے مختلف اشعار بھی اس بات کے ضامن ہیں کہ ان کے مزاج میں خودداری کی روشنی موجود تھی۔ سودا کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ فرمایئے:

غنچے کو دل کے یاں ہو دمِ سرد سے شگفت | شرمندہ اس چمن میں نہیں میں نسیم کا

سودا کہتے ہیں کہ میرا غنچۂ دل میرے دمِ سرد سے شگفتہ ہوتا ہے، اس لیے میں اس

---

[۱] آبِ حیات - مولوی محمد حسین آزاد - ص ۱۸۲، ۱۸۴

[۲] ۔ " " ص ۱۸۴، ۱۸۵

دنیا کے چمن میں موجِ نسیم کا شرمندہ احسان نہیں ہوں۔ سودا کا مندرجہ ذیل شعر بھی قابلِ توجہ ہے۔

کیوں کر ہو باغ جانا اس میرزا منش کا وان سرو میں نہیں ہے آداب کورنش کا

سودا باغ میں اس وجہ سے نہیں جانا چاہتے ہیں کیوں کہ وہاں سرو اُن کے سامنے ادب سے سر نہیں جھکاتا ہے۔

گو گھر میں جب کسی کے تو اے مہ جبیں رہا پروا نہیں ہمیں بھی یہ وہ دل نہیں رہا

سودا نے خودداری کی بنا پر محبوب کو بھی ٹھکرا دیا ہے۔

بوئے وفا و رنگِ محبت نہیں ہے یاں یارب تو اس چمن سے مرا آشیاں اُٹھا

سودا اس قدر خوددار واقع ہوئے ہیں کہ بوئے وفا و رنگِ محبت کی کمی کی بنا پر وہ چمن کو ترک کرنا پسند کرتے ہیں۔ سودا کا مندرجہ ذیل شعر ان کی خودداری کی ایک واضح مثال ہے۔

پہنچے گی تیرے گھر ہی جو جا ہے گی دخترِ رز سودا نہ جا کے منتِ پیرِ مغاں اُٹھا

سودا دخترِ رز کی وجہ سے پیرِ مغاں کا احسان نہیں لینا چاہتے ہیں۔

سودا کا مندرجہ ذیل شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:

باغباں کا نہ کیا حق نے ہمیں شرمندہ کسی گلشن میں یہ یک برگ گیا ہے گا ہے

سودا خوش ہیں کہ وہ باغباں کے احسان مند نہیں ہیں۔

سودا کے یہ سارے اشعار ان کی خودداری کے جذبے کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی خودداری کے واقعات سے مملو ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سودا کے مزاج میں نرگسیت داخل ہو گئی تھی۔

میر

(۱۱۳۵ھ — ۱۲۲۵ھ)

میر کی شخصیت اور شاعری دونوں میں خودداری کے آفتاب و ماہتاب چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں میر کی ٹکّر کا شاید ہی کوئی دوسرا خوددار شاعر پیدا ہوا ہو۔ میر کی خودداری کے اسباب کا جائزہ اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ میر کا تعلق کسی امیر کبیر خاندان سے نہیں تھا۔ اس لیے خاندانی برتری کی بنا پر ان میں خودداری نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کے دیگر اسباب ہیں۔ میر کی خودداری کا اہم سبب ان کا درویشانہ ماحول ہے جس کا تجزیہ ضروری ہے۔

میر کے والد صاحب محمد علی نہایت پرہیزگار اور متقی انسان تھے، اس بنا پر لوگ ان کو علی متقی کہنے لگے تھے۔ وہ بذات خود شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی کے مرید تھے اور ان کی رہنمائی میں انھوں نے تصوف و معرفت کی منزلیں طے کی تھیں۔ انھوں نے میر کو عشق کی تلقین کی اور فرمایا:

"اے پسر عشق بورز۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است۔ اگر عشق نمی بود، نظم کل صورت نہ می بست۔ بے عشق زندگانی وبال است۔ دل باختۂ عشق بودن کمال است۔ عشق بسازد و عشق بسوزد۔ در عالم ہرچہ است ظہور عشق است۔ آتش سوز عشق است۔ آب رفتار عشق است۔ خاک قرار عشق است۔ باد اضطرار عشق است۔ موت مستی عشق است۔ حیات ہوشیاری عشق است۔ شب خواب عشق است۔ روز بیداری عشق است۔ مسلم جمال عشق است۔ کافر جلال عشق است۔ صلاح قرب عشق است۔ گناہ بُعد عشق است۔ بہشت شوق عشق است۔ دوزخ ذوق عشق است۔ مقام عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت و حبیبیت برتر است۔

جمے بر آنند کہ حرکت آسمانہا حرکت عشقے ست ۔ یعنی بہ مطلوب نہ می رسند و سرگردانند۔" لہ

علی متقی نے میر کو کم سنی میں ہی عشق کے راز سے واقف کر دیا تھا۔
وں کہ عشق اور مادی دنیا میں بیر ہے ۔ اس لیے میر نے بچپن ہی میں ذہنی طور پر دنیا و ترک کر دیا تھا۔ اسی لیے ان کی ذات میں خودداری داخل ہوگئی تھی۔
یہی نہیں کہ علی متقی نے میر کو عشق کی تعلیم دی ۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا ہ ان کے بیٹے کے سینے میں عشق کی آگ پہلے ہی سے دہک رہی ہے ۔ اس کا ذکر میر اس طرح کرتے ہیں :

"ہر گاہ مرا در بغل کشیدے و بہ نظر شفقت رنگ کاہی مرا دیدے ، گفتے کہ اے سرمایہ جان ! ایں چہ آتشے است کہ در دلت نہاں ست و چہ سوزیست کہ ترا با جان است"۔ کہ

ایک روز علی متقی نے نماز اشراق کے بعد میر کو کھیل میں مصروف پایا تو انھوں نے کہا :
"ایں چہ بازی است کہ اختیار کردہ چہ ناہموار یست کہ بر خود ہموار ساختہ محو کسے شو کہ بلا گردان رنگین رفتن اور آسمانہا رفتہ آں باش کہ قربان ہر آن او دہا و جانہا ۔ عندلیب گلے باش کہ ہمیشہ بہار است آں سادہ شو کہ پرکار است و در آسمان دو رنگ و رنگ ندارد ۔ بشتاب فرصت غنیمت شمار و خود دریاب"۔ کہ

علی متقی ایک روز عالم جذب میں گھر سے نکل پڑے اور لاہور پہونچے، وہاں سے پھر دلی آئے ۔ اس کے بعد بیانہ کا سفر کیا ۔ یہاں ان کی نظر ایک "سید پسرے لالہ رخسارے"

لہ ذکر میر - مرتبہ مولوی عبد الحق ص ۶
کہ " " " ص ۸
کہ " " " ص ۹

خوش پر کارے" پر پڑی۔ اس کا نام سید امان اللہ تھا، وہ بھی علی متقی کے جذب وجنون سے متاثر ہوا اور ان کے قدموں پر گر پڑا، اور ان کا مرید ہو گیا۔ اسی نوجوان سے انھوں نے شادی کی بھی مذمت کی اور کہا:

"اے عزیز نمی دانی کہ لفظ داماد مرکب است از دام وکلمۂ او کہ فارسیان برائے نسبت آرند۔ از عالم آباد و نوشاد یعنی ہر کہ کدخدا شد گرفتار دام شد"

ان کی نصیحت کا سید امان اللہ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ بیوی سے بیزار نظر آنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی عمر دس دق میں مبتلا ہو گئی اور جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

میرؔ کی تربیت میں سید امان اللہ کا بھی زبردست ہاتھ ہے۔ میرؔ ان کو "عم بزرگوار" کہتے تھے۔ وہ سید امان اللہ کے ساتھ سات سال کی عمر سے رہتے تھے۔ اس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

"من در آں ایام ہفت سالہ بودم۔ با خودم مانوس ساخت و در گریبانم انداخت۔ یعنی بابا در ویدہ نگذاشتہ بہ فرزندی خویشم بر داشت۔ لحہ از خود جدا نمی کرد۔ وبانازونعم می پرورد۔ چنانچہ روز و شب بادمی ماندم و قرآن شریف بہ خدمت او می خواندم" [۱]

میرؔ کے اوپر شاہ احسان اللہ کے بھی اثرات ہیں۔ میرؔ نے ان سے بے خودی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک روز میرؔ اپنے عم بزرگوار کے ساتھ شاہ احسان اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے شاہ احسان اللہ کے دروازے پر دستک دی۔ مگر انھوں نے جواب دیا:

"احسان اللہ در خانہ نیست"

یہ سن کر سید امان اللہ نے کہا:۔

"اگر احسان اللہ نیست، امان اللہ است"

---

[۱] ذکر میر، صفحہ ۲۰

یہ سن کر احسان اللہ ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ میر نے ان کی بیخودی کو بھانپ لیا اور یہ بیخودی میر پر مرتے دم تک طاری رہی۔ شاہ احسان اللہ نے میر کو دیکھ کر کہا:

"این بچہ ہنوز سوختہ بال است۔ اما چنیں معلوم می شود کہ اگر بخوبی پر برآورد، بیک پرواز آں طرف تر آسمان خواہد رفت"

شاہ احسان اللہ نے میر کو نصیحت بھی کی اور فرمایا:

"بیاد بگذر از غرور و ہوس۔ نفس شوم سگیست ہرزہ مرس، اگر بگفتۂ او در رفتی، بر لیسیان او بچاہ رفتی۔ دگر بخودکشی از خود بگذری، راہے بسر کوچۂ آدمیت بری۔ نادان قباحت طول امل را در نمی یابد۔ عاقل از پے خود ریسمان نمی تابد"۔[1]

یہ عبارت اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہے کہ احسان اللہ نے میر کو نفس کشی کی بھی تعلیم دی۔

میر نے بایزید درویش سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ وہ سید امان اللہ کے ہمراہ ان درویش سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ انھوں نے بایزید کے بارے میں لکھا ہے:

"بالش از سنگ، بستر از خاک، ہر ساعت ہیائے ہلاک، شکستہ دل دگشادہ رو۔ برشتۂ جان و فتیلہ مو۔ دلدادۂ خاک افتادہ۔ خود را بہ خدا سپردہ۔ راہے بکام دل بردہ۔ اگر خوش چشمے از پیش او رفتے۔ بالائے چشمت ابرو نگفتے۔ باکسے بر نخوردے۔ بہ بیکسی بسر بردے چشم را اکثر اوقات بستہ می داشت۔ و دل را بے یاد حق نمی گذاشت۔ نان را بہ رغبت نہ دیدے۔ آب را از گلو بریدے"۔[2]

میر نے یہ دیکھا کہ بایزید درویش روٹی کو رغبت سے نہ دیکھتے تھے۔ یہ قناعت کی علامت تھی۔ میر نے قناعت کا سبق بایزید درویش سے بچپن ہی میں سیکھ لیا تھا۔

---

[1] ذکر میر۔ ص۲۶

[2] ،، ،، ص۲۷

بایزید نے پہلی ملاقات میں ہی میرؔ اور ان کے چچا کو یوں نصیحت کی :

"کسانیکہ حق شناسند مہرا از امید و یاس اند۔ عزیزا اینکہ ناخدایند دلدادگان رضایند۔ جان عاشقاں را کہ بہ تلخی کار است، خون ایشاں شیریں بسیار است۔ رنج را بر خود گوارا کن تا شایان راحت شوی" [۱]

اس عبارت میں بایزید نے میرؔ کو رنج و آلام برداشت کرنے کی ترغیب دی ہے سید امان اللہ نے میرؔ کو ہمراہ لے کر دوسری بار بایزید سے ملاقات کی۔ اس بار میرؔ نے ان کی زبان سے یہ کلمات سُنے :

"عبادت ما برائے ماست۔ آنجا خدائی است کرا پروا است"

یعنی میرؔ نے بایزید سے بے نیازی کا سبق سیکھا۔ میرؔ نے سید امان اللہ کے ہمراہ بایزید سے تیسری بار ملاقات کی۔ اس بار بایزید کی طبیعت بہت خراب تھی۔ انھوں نے سید امان اللہ سے بتایا :

"اے عزیزم سینہ ام بحدے می سوزد کہ گوئی در درون من کسے آتش می افروزد۔ نا ذکر می کنم زبانۂ آں آتش است۔ آہے کہ می کنم لائحہ ہماں شعلۂ سرکش"

بالآخر اسی شعلۂ سرکش نے ان کی جان لے لی۔ میرؔ نے بایزید کے سینے کی آگ اپنے دل میں منتقل کر لی اور وہ بھی زندگی بھر تپاں و سوزاں رہے۔

میر متقی نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو غیرت کی تعلیم دی۔ جب ان کا آخری وقت قریب آیا تو انھوں نے میرؔ کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن سے کہا :

"می خواہی کہ طفلان بے چارہ را بازی دہی و پس از مرگ دل بخرابی ایشاں نہی۔ دانستہ باش کہ حق تعالیٰ غیور است و غیور را دوست می دارد۔ غالب کہ میر محمد متقی دست نگر تو نشود۔ اگر بہ نوع دیگر پیش خواہی آمد،

[۱] ذکر میر، صہ ۳۶

کاسہ بر سرت خواہد شکست"۔ [1]

ان سارے واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر نے بچپن میں درویشانہ ماحول پایا تھا۔ اس ماحول سے انھوں نے درویشی، قناعت، بے نیازی اور خودداری کا سبق سیکھا تھا۔ یہ سبق ان کو زندگی بھر یاد رہا اور وہ خودداری کے راستے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔

میر نے اپنی زندگی میں بارہا خودداری، نازک مزاجی بلکہ بد دماغی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میر صاحب نواب آصف الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے تھے اور کبھی کبھی دربار میں حاضری بھی دیتے تھے۔ اس وقت نواب صاحب غزل کی فرمائش کر دیتے تھے۔ ایک بار نواب صاحب نے غزل کی فرمائش کی۔ اس کے دو تین دن کے بعد میر صاحب دربار گئے۔ نواب صاحب نے دریافت کیا۔"میر صاحب ہماری غزل لائے؟"

میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔"جناب عالی، مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے نہیں ہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے!"

نواب صاحب نے جواب دیا"خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجیے گا!" [2]

دراصل میر کو نواب صاحب کا تقاضا ناگوار معلوم ہوا۔ ان کی خودداری نے یہ برداشت نہ کیا کہ نواب صاحب ان سے غزل کا مطالبہ کریں۔ یہ خودداری نہیں بلکہ بڑی حد تک بد دماغی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد نے میر کی خودداری کا ایک اور واقعہ لکھا ہے۔ ایک دن نواب آصف الدولہ نے میر صاحب کو طلب کیا۔ جس وقت میر صاحب حاضر ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ نواب صاحب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے۔ پانی میں سبز لال مچھلیاں تیر رہی ہیں اور نواب صاحب محو تماشا ہیں۔ جب انھوں

---

[1] ذکر میر ص ۵۹

[2] آب حیات ۔ مولوی محمد حسین آزاد ۔ ص ۲۵۲

میر صاحب کو دیکھا تو مسرت کا اظہار کیا۔ پھر فرمائش کی کہ کچھ فرمائیے۔ میر صاحب نے غزل سُنانی شروع کی۔ نواب صاحب غزل سنتے جاتے تھے اور چھڑی سے مچھلیوں کو چھیڑتے جاتے تھے۔ میر صاحب کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا، اس لیے وہ ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے، مگر نواب صاحب کہتے کہ ہاں پڑھیے۔ میر صاحب نے چار شعر پڑھے، پھر ان سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ بولے کہ پڑھوں کیا، آپ مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب صاحب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرلے گا۔ میر صاحب کو یہ بات بہت بُری لگی۔ غزل کا پرچہ جیب میں ڈال کر گھر آئے اور دربار کی حاضری بند کردی۔

چند روز کے بعد نواب صاحب کی سواری بازار سے گزری۔ اتفاق سے میر صاحب بھی بازار سے گزر رہے تھے۔ دونوں میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ نواب صاحب نے نہایت محبت سے کہا: "میر صاحب آپ نے بالکل ہی ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔" میر صاحب نے جواب دیا: "بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔" [۵]

میر صاحب کی خودداری کا ایک اور واقعہ حکیم سید احمد خاں یکتاؔ نے دستور الفصاحت میں لکھا ہے۔ ان کا قول ہے:

"چناں چہ نقل است کہ روزے میر صاحب قصیدۂ تازہ گفتہ بہ دربار آوردند۔ نواب وزیر کہ از چاشت فراغت کردہ متوجہ شنیدن شد۔ میر صاحب شروع بخواندن کردند۔ و طول دادند۔ اتفاقاً آں روز ملا محمد مغل کہ تازہ از ولایت آمدہ و شاعر ہم بودہ، برائے ملازمت آوردہ، می خواست کہ آں ہم چیزے در مدح حضور بخواند۔ تطویل قصیدۂ میر وقت نگزاشت۔ ملا محمد تنگ آمدہ گفت کہ "میر صاحب، قصیدہ خوب ہست اما طولانی۔ اگر دماغ نواب صاحب وفا نمی کرد کہ می شنید؟" میر بمجرد استماع بیاض از دست انداختہ، منغض شدہ گفت کہ "اگر دماغ نواب وفا نمی کرد، دماغ من کجا

---

۵ آبِ حیات مولوی محمد حسین آزاد ص ۲۵۲، ۲۵۳

وخامی نماید" مطلق پاس حضور نہ کردہ نواب کہ خود خلق مجسم بودہ،
استمالۂ مزاج میر بہ کمال مہربانی انتہا نمودہ بقیۂ قصیدہ ہم تمام شنیدہ
خاطر را ہیچ نکردہ" [1]

میر کی خودداری کا ایک واقعہ سعادت خاں ناصر نے "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" میں
لکھا ہے۔ مؤلف کا قول ہے کہ:

"جب سرکار آصف الدولہ بہادر میں میر صاحب صیغۂ شاعری میں نوکر
ہوئے۔ ایک دن آصف جاہ کتاب خانہ میں جلوہ گر تھے اور دو دواوین
زیر و بالا رکھے تھے۔ ایک جلد نواب نامدار کے ہاتھ سے دور اور میر
صاحب کے نزدیک تھی۔ فرمایا "مجھے اٹھا دیجیے" میر صاحب نے
ایک خادم سے کہا "دوستو تمہارے آقا کیا فرماتے ہیں؟ نواب....
نے راست ہو کر اٹھا لیا، مگر یہ مزاج نہایت ناگوار گزری"۔ [2]

میر نے نواب سعادت علی خاں سے بھی خودداری کا اظہار کیا۔ نواب آصف الدولہ
کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں نے باقاعدہ سلطنت اودھ کی باگ ڈور سنبھالی۔
نواب سعادت علی خاں نے میر کو اپنے دربار میں ملازم نہیں رکھا بلکہ انشا کو اپنے مصاحبین
میں شامل کر لیا۔ ایک روز نواب سعادت علی خاں کی سواری چوک لکھنؤ سے گزر رہی تھی
جب وہ حکیم تحسین کی مسجد کے پاس پہونچے، تو وہاں کے لوگ بطور احترام کھڑے ہو گئے۔
میر بھی وہیں موجود تھے، مگر وہ بیٹھے رہے اس وقت نواب صاحب کے ساتھ انشا تھے نواب صاحب
نے انشا سے پوچھا" یہ کون شخص ہے جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے بھی نہ دیا" عرض کی
جناب عالی یہ وہی" گدائے متکبر" ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارے کا وہ
حال اور مزاج کا یہ عالم! آج بھی فاقے ہی سے ہوگا"

---

[1] دستور الفصاحت۔ حکیم سید احمد علی یکتا۔ مرتبہ عرشی رام پوری ص ۲۵، ۲۶

[2] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا۔ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی ص ۱۰۱

نواب سعادت علی خاں جب اپنے محل پہنچے تو انھوں نے خلعت بحال اور ایک ہزار روپے دعوت کا چوب دار کے ذریعہ میر صاحب کو بھجوایا۔ میر صاحب نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس کو کسی مسجد میں بھجوا دیجیے۔ یہ گنہہ گار اتنا محتاج نہیں۔ نواب صاحب کو بھی حیرت ہوئی کہ یہ شخص کس قدر بے نیاز ہے۔ اس کے بعد مصاحبین کے مشورے سے نواب صاحب نے خلعت انشا کے ذریعہ بھجوائی اور اس کو قبول کرنے کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ اپنے حال پر رحم نہیں کھاتے تو اپنے اہل و عیال کے حال پر رحم کھائیے۔ میر صاحب نے کہا صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں، میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف میرے حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے، مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی۔[1]

اس واقعہ سے میر کی خودداری پر واضح طور سے روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے یہ بات اپنی شان کے خلاف سمجھی کہ نواب صاحب نے ایک ملازم کے ذریعہ ان کو خلعت بھجوایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نواب صاحب نے ان کے مرتبے کو نہیں پہچانا۔

میر صاحب نے اپنی نازک مزاجی کا ایک واقعہ خود ہی بیان کیا ہے، یہ واقعہ اس وقت کا ہے کہ جب میر صاحب رعایت خاں کے ملازم تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شبِ ماہ بر مہتابی پسر خواندۂ رو بروئے خان نشستہ بود و می خواند۔ چوں مرا دید گفت کہ میر صاحب دو سہ شعر ریختہ خود بایں بیاموزید کہ ایں طفل و السنہ بکار درست کردہ بخواند۔ گفتم نفس ایں کار ندارم۔ گفت شمار البرمن۔ چوں پائے تبعیت در میان بود، ناچار حکم او کشیدم پنج شعر ریختہ یاد آموختم۔ اما بسیار بر طبع نازک من گراں آمد آخر بعد از دو سہ روز خانہ نشیں گشتم، ہر چند لطف فرمود نرفتم و ترک آں روزگار گرفتم۔"[2]

---

[1] آب حیات - مولوی محمد حسین آزاد ص ۲۶۹، ۲۷۰
[2] ذکر میر: مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۷۰

دراصل میر کی خودداری نے ان کو برباد کر دیا تھا۔ خودداری ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی تھی، مگر خودداری رزق کی ضامن نہ تھی۔ اس لیے میر نے اپنی زندگی فاقہ مستی میں بسر کی۔ مولوی محمد حسین آزاد اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی برداشت نہ رکھتے تھے، لیکن زمانہ جس کی حکومت سے کوئی سر نہیں اٹھا سکتا اُس کا قانون اس کے بالکل بر خلاف ہے۔ نتیجہ یہ کہ فاقے کرتے تھے، دُکھ بھرتے تھے اور اپنی بد دماغی کے سایے میں دنیا اور اہلِ دنیا سے بیزار گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔" [1]

مولوی محمد حسین آزاد آگے چل کر میر کی خودداری پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:

"چناں چہ ان کی ثابت قدمی کا وصف کسی زبان سے نہیں ادا ہو سکتا کہ اپنی بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ دنیائے فانی کی مصیبتیں جھیلیں، اور جو اپنی آن بان تھی، اسے لیے دنیا سے چلے گئے اور جس گردن کو خدا نے بلند کیا تھا سیدھا خدا کے ہاں لے گئے۔ چند روزہ عیش کے لالچ سے یا مفلسی کے دکھ سے اسے دُنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔" [2]

میر صاحب کی شاعری بھی خودداری کی مثالوں سے پُر ہے۔ انھوں نے اپنے مختلف اشعار میں اپنی خودداری کو واضح کیا ہے۔ مثلاً ان کا نہایت مشہور شعر ہے:

سر کسو سے فرو نہیں آتا   حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

دراصل جو بندہ ہے اس کو سر تو جھکانا ہی ہوگا۔ میر کو اس بات کا افسوس ہے کہ وہ بندے ہیں، اگر وہ خدا ہوتے تو ان کو سرِ تسلیم خم نہ کرنا ہوتا۔ مگر ان کی قسمت میں خدائی کہاں؟

میر صاحب دستِ سوال دراز کرنا جانتے ہی نہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

---

[1] آبِ حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد صفحہ ۲۶۳

[2] " " " صفحہ ۲۶۵

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

میر خوانِ فلک کے بھی مہمان ہونا نہیں چاہتے:

مہمان میر مت ہو خوانِ فلک پہ ہرگز — خالی یہ مہر و ماہ کی دونوں کابیاں ہیں

میر کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی کی بات برداشت نہیں کر سکتے۔

اب مجھ ضعیف و زار کو کچھ مت کہا کرو — جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات

میر صاحب خود کو مصاحبت کے لیے نا اہل تصور کرتے ہیں:

نہیں میر مستانہ صحبت کا باب — مصاحب کرو کوئی ہشیار سا

میر فطرت کا احسان لینا بھی گوارا نہیں کرتے:

گلِ پژمردہ کا نہیں ممنون — ہم اسیروں کا گوشۂ دستار

وہ حسنِ فطرت کے پرستار بھی نہیں، چناں چہ کہتے ہیں:

مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں — میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

یہ حقیقت ہے کہ میر جیسا خوددار شاعر اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے۔ میر کی خودداری اردو شاعری میں ضرب المثل ہے۔

ناسخ

(وفات ۱۲۵۴ھ)

شیخ امام بخش ناسخ کے یہاں خودداری کے شعلے کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب ان کی خاندانی برتری نہیں ہے۔ کیوں کہ ناسخ ایک غریب انسان کے بیٹے تھے، کچھ لوگوں کا قول ہے کہ ان کے والد صاحب کا نام خدا بخش تھا جو لاہور کے ایک خیمہ دوز تھے، مگر یہ بات بھی مشکوک خیال کی جاتی ہے۔ کیوں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خدا بخش خیمہ دوز نے ان کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ جب ناسخ کے اصل باپ کا بھی سراغ نہیں ملتا تو ظاہر ہے کہ ان میں خودداری کا جوہر بربنائے علوئے خاندان کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔

در اصل ناسخ کی خودداری کے دیگر اسباب ہیں۔

خدا بخش لاہور سے فیض آباد آئے اور یہیں ناسخ پیدا ہوئے۔ انھوں نے ناسخ کی تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ کی۔ کچھ عرصہ کے بعد خدا بخش کا انتقال ہو گیا۔ خدا بخش کے انتقال کے بعد ان کے بھائیوں نے میراث کا دعویٰ کیا، مگر ناسخ نے جواب دیا کہ جس طرح میں خدا بخش کو اپنا باپ تصور کرتا تھا، اسی طرح آپ لوگ میرے باپ ہیں۔ صرف آپ میرے اخراجات کے کفیل ہو جائیے۔ اس پر ان کے چچا راضی ہو گئے۔

ناسخ کو فشارِ خون کا عارضہ تھا، اس لیے ایک زمانے میں وہ صرف بیسنی روٹی گھی میں بھگو کر کھاتے تھے۔ ایک بدنیت چچا نے ان کے کھانے میں زہر شامل کر دیا مگر ان کو کسی طرح معلوم ہو گیا، انھوں نے چند دوستوں کے سامنے روٹی کا ایک ٹکڑا کتے کو کھلایا جو مر گیا۔ تب یہ بات ثابت ہو گئی کہ کھانے میں زہر ملایا گیا تھا۔ اس کے بعد وراثت کا جھگڑا باقاعدہ شروع ہوا، اور مقدمہ عدالت شاہی تک پہنچا۔ آخر میں فیصلہ ناسخ کے حق میں ہوا

جب حکومت اودھ کا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گیا تو ناسخ بھی لکھنؤ آ گئے اور محلہ ٹکسال میں رہنے لگے۔ چوں کہ بذاتِ خود مالدار تھے اس لیے کسی کی نوکری نہیں کی۔ ایک بار راجہ چندولال نے پندرہ ہزار روپے دے کر بلا بھیجا، اور ملک الشعرا کا خطاب دلانے کا وعدہ کیا۔ مگر انھوں نے ملازمت منظور نہیں کی۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ناسخ بذاتِ خود بہت خوددار تھے۔

ناسخ کے زمانے میں غازی الدین حیدر اودھ کے نواب تھے۔ ناسخ کی شہرت کا نقارہ بج رہا تھا۔ اس کی آواز غازی الدین حیدر کے بھی کانوں میں پہنچی۔ بقول مولوی محمد حسین آزاد انھوں نے اپنے وزیر نواب معتمدالدولہ سے کہا کہ "اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سنائیں تو ہم انھیں "ملک الشعرا" کا خطاب دیں"۔ معتمدالدولہ خود ناسخ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے نواب صاحب کا پیغام ناسخ تک پہنچایا۔ ناسخ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اور انھوں نے جواب دیا کہ "مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے، ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا"

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے ضرور ناسخ کی خودداری کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں اس واقعہ کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ اس سے قبل وہ نواب محمد تقی خاں، رئیس فیض آباد، میر کاظم علی، رئیس لکھنؤ اور مرزا حاجی کی محفلوں کی رونق بن چکے تھے۔ اس کے بعد نواب معتمد الدولہ آغا میر سے بھی تعلقات قائم کر لیے، ان حقائق کی روشنی میں نواب غازی الدین حیدر کا دربار تو اعلیٰ تر تھا، اس کو وہ کیسے ٹھکرا سکتے تھے۔ یہ بات ضرور معقول معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ ناسخ بذات خود مالدار تھے۔ اس لیے وہ کسی رئیس کی خوشامد نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری میں بھی خودداری کی جھلکیاں موجود ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

بوجھ اپنا کبھی ڈالا نہ کسی پہ میں نے   ہوئی تعمیر مری سقف سے دیوار جدا

ناسخ اتنے خوددار ہیں کہ انھوں نے کبھی اپنا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا۔ یہاں تک کہ جب ان کا مکان تعمیر ہوا تو انھوں نے اپنی چھت کا بوجھ دیوار پر پڑنے نہیں دیا۔ ناسخ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک دلیل پیش کی ہے مگر یہ دلیل کمزور ہے کیونکہ کوئی چھت بغیر دیوار کے قائم نہیں ہو سکتی۔ ناسخ نے ایک اور شعر میں خودداری کا اظہار کیا ہے۔

خاک میں ملتی ہے غیرت، روندتے ہیں مجھ کو غیر   اس گلی سے بس ہماری خاک اے صرصر اٹھا

بعد فنا ناسخ کی خاک محبوب کی گلی میں موجود ہے، یہاں اس کو غیر روندتے ہیں۔ اس لیے ان کی غیرت خاک میں ملی جا رہی ہے۔ اسی بنا پر وہ آندھی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کی خاک کو محبوب کی گلی سے اٹھالے۔

بہر حال ناسخ کی شاعری میں خودداری کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ دراصل ناسخ کے کلام میں خودداری سے زیادہ خود پسندی کی مثالیں ملتی ہیں۔

آتش

(۱۱۹۲ھ — ۱۲۶۳ھ)

آتش کی شاعری کے چمن میں خودداری کے شعلے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو کبھی گل معلوم ہوتے ہیں، کبھی انجم۔ اور کبھی کبھی تو انگارے بن کر قارئین کے احساس کو سلگا دیتے ہیں۔ ہم کو اس کے اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

آتش ایک صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی صبر و تحمل، قناعت و توکل اور وضعداری و خودداری کے ساتھ گزاری۔ ان کو نواب غازی الدین حیدر سے اسی روپے مہینہ ملتا تھا۔ ان میں سے پندرہ روپیہ گھر میں دے دیتے تھے، باقی روپیہ غربا پر صرف کر دیتے تھے، جب روپیہ پاس نہیں ہوتا تھا تو فاقہ کشی اختیار کرتے تھے۔ مگر ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ کسی سے اپنے فاقے کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں کہ اگر شاگردوں کو پتہ چل جاتا تھا تو وہ کچھ لے کر حاضر ہوتے تھے کہ آپ نے ہم سے کیوں نہیں بتایا۔ آتش جواب دیتے تھے کہ "تم لوگوں نے کھلا کھلا کر ہمارے نفس حریص کو فربہ کر دیا ہے۔" آتش کے مربیوں میں فقیر محمد خاں گویا، سید محمد خاں رند، میر دوست علی خلیل اور خواجہ وزیر تھے۔ یہ لوگ ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔

آتش کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ امیروں کے دربار میں نہیں جاتے تھے اور نہ ان کی شان میں قصائد کہتے تھے۔ مولوی محمد حسین کا قول ہے کہ:

> "ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کیے تھے، بوریا بچھا رہتا تھا، اسی پر ایک لنگ باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے، اور عمر چند روزہ کو اس طرح گزار دیا جیسے کوئی بے نمازی دبے پردہ فقیر تکیہ میں بیٹھا ہوتا ہے۔" [۱]

---

[۱] آب حیات - مولوی محمد حسین آزاد - ص ۴۷۹

عبدالرؤف عشرت نے "تذکرۂ آبِ بقا" میں لکھا ہے کہ مولوی صادق نے آتش کو دیکھا تھا اور وہ ان کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"گبیروانہ بند باندھتے تھے، ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا جس میں ایک چھلّہ سونے کا رہتا تھا، دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھلّہ رہن رکھ کر فاقہ شکنی کرتے تھے۔ بیچے کام کا سلیم شاہی جوتا ایک اشرفی کی قیمت کا پہنتے تھے۔ بے طمع اور بے غرض تھے کبھی شاگرد سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کرتے تھے اور اکثر اپنی دولت کو دعوت اور ضیافت میں لگا دیا کرتے تھے۔ کچھ تنخواہ اودھ کے بادشاہ کی طرف سے ملتی تھی، وہ چار دن میں خرچ کر ڈالتے تھے"۔ [1]

خواجہ عبدالرؤف عشرت نے منشی امیراللہ تسلیم کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ "جس روز فاقہ ہوتا دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہتے"۔ انھوں نے ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے جس سے آتش کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

"کہتے ہیں کہ ایک روز آتش فاقے سے تھے، اس کی خبر فقیر محمد گویا کو ہوئی۔ وہ کچھ روپیے کر آتش کے گھر پہنچے، مگر دروازہ بند تھا۔ انھوں نے دستک دی۔ آتش نے پوچھا "کون؟" انھوں نے جواب دیا "فقیر"۔ تب آتش نے کہا "فقیر کا میرے یہاں کام نہیں۔ آج خدا مہمان ہے"۔ (یعنی فاقہ ہے) یہ سن کر فقیر محمد خاں گویا واپس ہو گئے۔ دوسرے روز پھر آئے، پھر دروازہ بند پایا۔ چناں چہ دستک دی۔ اس بار آتش نے بڑی مشکل سے دروازہ کھولا۔ اسی وقت آتش کا کم سن لڑکا محمد علی چھت پر کنکوا اڑا رہا تھا۔ گویا نے اس کو بلایا، لڑکا کنکوا، چرخی اور ڈور سمیت آگیا۔ گویا نے کہا یہ کنکوا اچھا نہیں ہے۔ کتنی لیتا ہو گا، ڈور بھی اچھی نہیں سُتی ہے، یہ کہہ دو ہزار کی دو تھیلیاں

---

[1] تذکرہ آبِ بقا۔ خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت ص ۱۰

لڑکے کے سامنے رکھ دیں اور کہا کہ ان سے ڈور کنکوا خرید لینا۔ آتش سمجھ گئے کہ فقیر محمد خاں گویا میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے ان سے کہا کہ خاں صاحب آپ کا فرض تھا کہ لڑکے کو کنکوا اڑانے پر تادیب کرتے۔ نہ کہ آپ خود اس کو شہ دے رہے ہیں۔ اس کے بعد آتش نے ایک تھیلی سے صرف پانچ روپے نکالے اور اپنے لڑکے کو دیے اور کہا خاں صاحب کو سلام کرو۔ باقی روپے انھوں نے خاں صاحب کو واپس کر دیے۔ [1]

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت نے آتش کی خودداری کا ایک اور واقعہ پیش کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ واجد علی شاہ جب ولی عہد تھے تو انھوں نے آتش کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے صلے میں وہ آتش کو سو روپے ماہوار دیتے تھے۔ آتش اس وقت تک نابینا ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ اپنے کسی شاگرد سے نواب واجد علی شاہ کی غزل سنتے تھے اور اصلاح دے دیتے تھے۔ ایک بار نواب صاحب کو کسی شعر پر شک ہوا۔ انھوں نے آتش کی اصلاح کے بارے میں اپنے رفقا سے مشورہ کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جس طرح آپ نے شعر کہا تھا وہی درست اور مناسب ہے۔ چوں کہ آتش نابینا ہیں، اس لیے ان کے شاگرد اصلاح دیتے ہیں اور کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔ یہ خبر آتش کو پہنچی ان کو سخت صدمہ ہوا۔ جب نواب کی غزل دوبارہ اصلاح کے لیے آئی تو اس پر انھوں نے اپنے شاگرد سے لکھوا دیا۔ ماشاء اللہ خوب غزل کہی ہے۔ اس کے بعد تین ماہ کے اندر جتنی غزلیں اصلاح کے لیے آئیں ان سب پہ یہی لکھوا دیا۔ اور جب سہ ماہی تنخواہ آتش کو بھجوائی گئی تو انھوں نے واپس کر دی اور کہا کہ "میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا، جب غزل بناتا تھا تنخواہ لیتا تھا۔ اب اصلاح ہوتی نہیں تنخواہ کس بات کی لوں"۔ نواب واجد علی شاہ نے علی نقی خاں وزیر اعظم کو آتش کی خدمت میں بھیجا۔ آتش نے ان کو بھی یہی جواب دیا۔ علی نقی خاں نے آتش کے شاگردوں سے دریافت کیا کہ وہ کس بات پر خفا ہیں۔ شاگردوں سے ناراضگی کا سبب معلوم کر کے نواب صاحب سے بیان کیا۔ اس کے بعد نواب واجد علی شاہ بنفسِ نفیس آتش کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی کے لیے درخواست کی۔

---

[1] تذکرہ آبِ بقا۔ خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی۔ ص ۱۱

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت نے منشی قمر صاحب کا ایک بیان پیش کیا ہے جس سے آتش کی خودداری اور توکل پر روشنی پڑتی ہے۔ قمر صاحب کہتے ہیں:

"جب ہم نے دیکھا ہے تو آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ گورے دُبلے پتلے تھے، سر پر بال لمبے لمبے تھے۔ جوڑا باندھتے تھے۔ مونچھیں بڑی بڑی۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ ایک تہمد آدھی باندھے ہوئے اور آدھی اوڑھے مکان میں بیٹھے رہتے تھے۔ چہرے سے بانکپن ٹپکتا تھا۔ ایسا متوکل آدمی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔" [1]

ان تمام واقعات سے آتش کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔ دراصل آتش کی زندگی اور شاعری میں ہم کو کوئی بُعد نظر نہیں آتا جس طرح ان کی زندگی خودداری کے ستاروں سے چمک رہی ہے اس طرح ان کی شاعری خودداری کے پھولوں سے مہک رہی ہے۔

آتش کی شاعری میں خودداری کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ مثلاً آتش نے ہمیشہ دوسروں کے احسان سے گریز کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

اے فلک مرہونِ احساں تو نہ تیرا میں ہوا　　شکر ہے مجھ کو خدا نے بے سر و ساماں کیا

چوں کہ آتش مفلس ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر زمانہ ان کا دشمن بھی ہو گا تو ان کا کیا بگاڑے گا؟

طبل و علم ہے پاس میں اپنے نہ ملک و مال　　ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتش کی خودداری کا عالم اس شعر میں بھی ملاحظہ فرمایئے:

وحشت نے نہیں جب کہ گلستاں سے نکالا　　غیرت نے قدم پھر نہ بیاباں سے نکالا

آتش اتنے خوددار ہیں کہ وہ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ کسی دوسرے انسان کی بھی ذلت برداشت نہیں کر سکتے۔

---

[1] تذکرہ آب بقا - خواجہ محمد عشرت، لکھنؤ، ص ۱۷

آگیا مجھ کو پسینہ جب کوئی ملزم ہوا　　خاک میں میں مل گیا، جو سر کسی کا خم ہوا

آتش کو بوریہ زیادہ پسند ہے۔ اس لیے وہ تخت سلیماں کو بھی ٹھکرانے کے لیے تیار ہیں:

بادشاہی سے فقیری کا ہے رتبہ بالا　　بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

آتش کی خودداری کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ وہ محبوب کو خط ہی لکھنا نہیں چاہتے، ورنہ خط پہنچانے کے لیے کبوتر سینکڑوں ہیں۔

میں ہی اپنے شوق کا نامہ اسے لکھتا نہیں　　اڑ کے لے جانے کو حاضر ہیں کبوتر سینکڑوں

عام طور سے شعرا محبوب کے تغافل کا گلہ کرتے ہیں، مگر آتش کا قول ہے کہ محبوب کا تغافل ان کے حق میں اچھا ہے کیوں کہ اس طرح یار کا احسان ان کی گردن پر نہیں رہتا ہے چناں چہ وہ کہتے ہیں:

اٹھاؤں کس لیے احسانِ یار گردن پر　　مرا تو اس کے تغافل سے کام ہوتا ہے

بہر حال آتش کی زندگی اور شاعری دونوں میں خودداری کے آبگینوں کی تابش موجود ہے۔ میر کے بعد اگر کوئی دوسرا خوددار شاعر نظر آتا ہے تو وہ آتش ہی ہیں۔ ہر کسی اعتبار سے میر اور آتش ایک ہی گلشن کے دو پھول ہیں۔

مومن

(۱۲۱۵ھ — ۱۲۶۸ھ)

مومن کی خودداری میں ایک خاص قسم کی کھنک اور جھنکار موجود ہے۔ ان کی خودداری کی تان کا جب ذکر آتا ہے تو شاعری کی فضا میں شعلہ سا لپک جاتا ہے۔ مومن کی خودداری کے واضح اسباب موجود ہیں۔

مومن کو خاندانی وقار حاصل تھا۔ ان کے آبا و اجداد شرفائے کشمیر سے تھے۔ حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دونوں بھائی شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے اور شاہی طبیبوں میں شامل کر لیے گئے۔ ان لوگوں کو شاہ عالم کے عہد میں پرگنہ نارنول موضع بلاہہ میں جاگیر

عطا ہوئی۔ جب انگریزوں کی حکومت دلی میں قائم ہوئی تو نارنول کا پرگنہ جھجر کی ریاست میں شامل ہو گیا۔ جس کے مالک نواب فیض طلب خاں تھے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب نے ان حکیموں کی جاگیر ضبط کر لی اور ایک ہزار روپیہ سالانہ حکیم نامدار خاں کے ورثا کو بطور پنشن مقرر کر دیا۔ اسی پنشن سے مومن خان کے والد حکیم غلام نبی خاں کو حصہ ملتا تھا۔ ان کے بعد مومن کو بھی اس پنشن سے ان کا حق ملتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ان کو انگریزی سرکار سے بھی کچھ رقم مل جاتی تھی۔ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر تھی۔ اس میں سے ایک چوتھائی حصہ حکیم غلام نبی خاں کو ملتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد مومن بھی اس پنشن کے حقدار ہو گئے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن ایک اعلیٰ اور خوش حال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی ذات میں خودداری پیوست ہو گئی تھی۔

مومن کی خودداری کا ایک اور بھی سبب ہو سکتا ہے۔ مومن کو امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی سے عشق تھا اور وہ اپنے عشق میں کامیاب بھی تھے۔ چوں کہ صاحب جی بھی شاعر تھیں، اس لیے ان کے پہلو میں بھی ایک دھڑکتا ہوا دل موجود تھا۔ ان کے مندرجہ ذیل شعر میں ان کے دل کی دھڑکن سنا جا سکتا ہے:

نظر ہے جانبِ اغیار دیکھیے کیا ہو　　　پھری ہے کچھ نگہ یار دیکھیے کیا ہو

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مومن کو جوابی محبت حاصل تھی۔ جب عاشق کو معشوق کی طرف سے جوابی محبت کی دولت ملتی ہے تو اس میں خودداری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن میں بھی خودداری کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ مومن دہلی کے نامور شعراء سے تھے۔ وہ اپنے دور میں بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے کلام نے ان کو ایک اعلیٰ مرتبہ بخشا تھا۔ مومن کی خودداری کا یہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے۔

مومن کی خودداری کی مثالیں ہم کو ان کی زندگی سے بھی مل جاتی ہیں۔ انھوں نے دیگر شعرا کی طرح بادشاہوں اور امیروں کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ صرف راجا اجیت سنگھ کی مدح میں جو راجا کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کے بھائی تھے اور دہلی میں مقیم تھے ایک قصیدہ نظم کیا، اور وہ قصیدہ بھی عمداً نہیں کہا بلکہ ایسا ہوا کہ ایک روز راجا جیت سنگھ نے

مصاحبین کے ساتھ کوٹھے پر بیٹھے تھے کہ مومن کا اُدھر سے گزر ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ یہی مشہور شاعر مومن ہیں۔ راجہ صاحب نے ان کو بلوایا اور اُن کا کلام سُنا اور چلتے وقت ایک ہتھنی نذر کی۔

مومن نے کہا۔ "مہاراج، میں غریب آدمی ہوں، اسے کہاں سے کھلاؤں گا؟"

تب راجہ نے سو روپے مزید عنایت کیے۔ مومن اس ہتھنی پر سوار ہو کر اپنے گھر واپس آئے، مگر آتے ہی اس کو فروخت کر دیا اور راجہ صاحب کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر روانہ کر دیا، جس کا مطلع یہ ہے :

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری کثرتِ درد سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

مولوی محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں یہ بھی لکھا ہے کہ "وہ اس قدر غیور تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارہ نہ کرتے تھے۔ مومن کی زندگی میں خودداری کا ایک اور واقعہ ملتا ہے۔

"ایک بار راجہ کپور تھلہ نے ان کو ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہزار روپیہ سفر خرچ کے لیے بھی روانہ کر دیا۔ مومن اس ملازمت کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہی تنخواہ وہاں ایک گویّے کی بھی ہے تو انھوں نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا "جہاں میری اور گویّے کی تنخواہ برابر ہو، میں نہیں جاتا۔" [1]

مومن کی شاعری بھی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ ایک خوددار انسان تھے، چناں چہ ان کی شاعری میں ہم کو خودداری کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ ان کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ زندگی جیسی حقیر شے کے لیے حضرت عیسیٰ کے منت گزار نہیں ہونا چاہتے۔ مومن کا یہ شعر بے حد مشہور ہے۔

---

[1] آبِ حیات مولوی محمد حسین آزاد۔ ص ۵۲۸

زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے — منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی

مندرجہ ذیل شعر میں بھی مومن منتِ عیسیٰ سے گریز کر رہے ہیں۔

مر جائیں گے پر منتِ عیسیٰ نہ کریں گے — تشبیہ نہ بس دیتے ہیں لبہائے بتاں کو

مومن کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے محبوب کے کرم سے احتراز کرتے ہیں

یاں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہوگا — ان سے بدخو کا کرم بھی ستم جاں ہوگا

مومن ایک خوددار انسان ہیں، اس لیے جب انھوں نے الفت میں تلخ تجربہ حاصل کر لیا تو دوبارہ اس کوچے میں قدم رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔

تو نے چاہت کا مزہ اے فتنہ گر دکھلا دیا — نام الفت کا لوں گا جب تلک ہے دم میں دم

مومن اپنے محبوب سے خائف نہیں ہیں، اگر محبوب اوروں کا ہو گیا ہے تو خدا ان کا ہے۔

وہ بت جو ہے اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے — مومن نہ کبھی بوسہ یا سجدہ کریں گے

مومن جنونِ عشق کا بھی احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔

سر پر جنونِ عشق کا احساں نہیں رہا — بے قودہ تو دہ خاک سبکدوش ہو گئے

مومن اس قدر خوددار واقع ہوئے ہیں کہ وہ مرہم کے بھی منت کش نہیں ہونا چاہتے

داغ تو ہے چارۂ داغ کہن کی فکر میں — درد بے درماں مرا منت کش مرہم نہیں

غرضیکہ مومن کی شاعری میں خودداری آئینہ کی طرح چمک رہی ہے جس سے ان کی شخصیت روشن ہو جاتی ہے اور ان کے فن کی فضا میں چاندنی پھیل جاتی ہے۔

غالب

(۱۲۱۲ھ — ۱۲۸۵ھ)

غالب کی شاعری کی فضا میں خودداری کوندے کی طرح لپکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات ان کو اپنی خودداری کے آبگینے کو ٹھیس لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی مگر مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب ایک خوددار انسان تھے۔ غالب

کی خودداری کے مختلف اسباب ہیں۔ ان کی خودداری کا سب سے بڑا سبب ان کی نسلی برتری ہے۔ ان کے خاندان کا سلسلہ ایران کے بادشاہ تور ابن فریدون تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان پیش دادیاں کہلاتا تھا۔ اس خاندان کی بنیاد کیومرس نے ۵۰۰ برس قبل مسیح ڈالی تھی۔ سیامک، ہوشنگ، طہمورس، جمشید، فریدون، تور، منوچہر، نوذر، افراسیاب اور ذاب۔ اس خاندان کے بادشاہ گزرے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد پیش دادیوں کا زوال ہوگیا، اور کیانیوں نے ایران میں اپنی سلطنت قائم کرلی۔ مگر پیش دادیاں خاندان بالکل نیست ونابود نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے کچھ افراد ترکستان میں آباد ہوگئے۔ اس خاندان کا ایک مشہور سردار توقاق گزرا ہے جو مسلمان ہوگیا تھا۔ مگر اس خاندان کو اس کے بیٹے سلجوق نے بہت ترقی دی اور اسی کے نام پر ایران میں سلجوقی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ آخر کار سلجوقی خاندان پر بھی زوال آگیا۔ اس خاندان کے ایک شہزادے ترسم خان نے سمرقند میں اقامت اختیار کی۔ اس کا بیٹا قوقان بیگ خاں اپنے باپ سے ناراض ہوکر لاہور آیا اور نواب معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ نواب معین الملک کا ۱۷۵۳ء میں انتقال ہوگیا۔ تب قوقان بیگ دہلی آگئے اور شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کو پچاس سوار اور نقارہ شاہی سلطنت سے عطا ہوا۔ اس کے علاوہ پہاسو کا علاقہ بھی بخش دیا گیا۔ قوقان بیگ کے بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا جو غالب کے پدر بزرگوار تھے۔ اس سلسلۂ حسب ونسب سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غالب کا تعلق ایران کے شاہی خاندان سے تھا۔ غالب کی ذات میں خودداری کا خاص سبب یہی ہے۔

مرزا غالب کی شخصیت پر ان کے ماحول کا بھی اثر پڑا ہے۔ انھوں نے دولت وامارت کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ غالب جب پانچ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ بختاور سنگھ راجہ الور کی حمایت میں مارے گئے تھے۔ اس لیے راجہ نے دو گاؤں اور کچھ نقد روزینہ غالب اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی پرورش کے لیے مقرر کردیا تھا باپ کے انتقال کے بعد ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کی۔ مرزا نصراللہ بیگ، لارڈ لیک کے ملازم تھے اور چار سو سوار کے رسالدار تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے ہلکر کی سلطنت

کے سپاہیوں سے سونک اور سون کے علاقے چھین لیے۔ لارڈ لیک نے ان کی شجاعت سے خوش ہو کر انھیں کو یہ علاقے بخش دیے۔

اس واقعہ کے ایک سال کے بعد مرزا نصراللہ بیگ ایک معرکے میں ہاتھی سے گر کر فوت ہو گئے۔ مرزا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد سونک اور سون کے علاقے ان کی ملکیت سے نکل گئے۔ اب مرزا نصراللہ بیگ کے سارے نواب احمد بخش نے ان کے متعلقین کی پرورش کی ذمہ داری لی۔ لارڈ لیک نے نواب احمد بخش کو ان کی خدمات کے عوض فیروزپور جھرکہ اور لوہارو کا علاقہ بخش دیا تھا۔ اس کے معاوضہ میں وہ برطانوی حکومت کو ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے تھے۔ اب نواب احمد بخش نے لارڈ لیک سے یہ طے کیا کہ ۲۵ ہزار سالانہ معاوضہ معاف کر دیا جائے اور وہ اب ۱۵ ہزار روپیہ سالانہ اپنے فوجی دستے پر خرچ کریں گے، اور دس ہزار روپیہ سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کے متعلقین پر صرف کریں گے۔ کچھ عرصہ کے بعد نواب صاحب نے نصراللہ بیگ کے متعلقین پر خرچ کرنے والی رقم کو ۵ ہزار طے کرا لیا اور اس کا بٹوارہ یوں کیا کہ ۲ ہزار روپیہ سالانہ خواجہ حاجی کو ملیں اور تین ہزار روپیہ میں سے ۱½ ہزار روپیہ سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کی ماں اور تین بہنوں کو ملیں اور ۱½ ہزار روپیہ سالانہ مرزا غالب اور مرزا یوسف پر خرچ ہوں، اس طرح غالب کو ۷۵۰ روپیہ سالانہ کی رقم بطور پنشن مل جاتی تھی۔

مرزا غالب اپنے ننھیال کی طرف سے بھی کافی مالدار تھے۔ ان کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے پاس آگرہ میں کافی جائداد تھی۔ غالب کا بچپن ان کے ننھیال ہی میں گزرا، اس لیے ان کو بچپن میں معاشی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غرضیکہ مرزا غالب کا ماحول امیرانہ اور رئیسانہ تھا۔ دراصل غالب پر ان کی نسل اور ان کے ماحول کا گہرا اثر پڑا ہے جس کی بنا پر ان میں خودداری پیدا ہو گئی تھی۔

غالب میں خودداری کا ایک اور سبب بھی ہے۔ غالب ایک کامیاب عاشق تھے انھوں نے اپنی ابتدائی عمر میں ایک ڈومنی سے عشق کیا تھا۔ وہ ڈومنی بھی غالب پر شیدا تھی، اس طرح غالب کو اپنی محبت کا جواب مل رہا تھا۔ یعنی دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے محبت کے شعلے پھول بن کر برس رہے تھے۔ جب اس ڈومنی کا انتقال ہو گیا تو غالب کو سخت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے

اس کی موت پر ایک پُر درد غزل کہی، جو ان کے شکستہ دل کی جھنکار معلوم ہوتی ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے:

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اس غزل سے یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ ڈومنی بھی غالب کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس لحاظ سے غالب کا عشق کامیاب تھا۔ اس کامیابی نے غالب کو اور بھی خوددار بنا دیا تھا وہ معشوق کے ناز و غمزہ برداشت کرنے کے لیے تیار تھے، مگر اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔

غرضیکہ غالب ایک خوددار انسان تھے۔ انھوں نے اپنی خودداری کا مظاہرہ اپنی زندگی میں بھی کیا ہے۔ غالب نے ۱۸۲۶ء میں اپنی پنشن کے تصفیہ کے سلسلے میں کلکتے کا سفر کیا۔ انھوں نے جاتے وقت لکھنؤ میں بھی کئی ماہ قیام کیا۔ اس وقت لکھنؤ میں نواب غازی الدین حیدر بادشاہ تھے اور معتمد الدولہ آغا میر وزیر تھے۔ غالب نے غازی الدین حیدر کی شان میں ایک پُر شکوہ قصیدہ کہا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ اس قصیدہ کو نواب صاحب کے حضور میں پیش کریں اور ان کو اس قدر انعام مل جائے کہ وہ کلکتہ کا سفر کر سکیں مگر غالب کو اتنا موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنا قصیدہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی ملاقات وزیر معتمد الدولہ آغا میر سے بھی نہ ہو سکی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غالب نے ان سے ملاقات کی دو شرطیں رکھی تھیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ وزیر موصوف ان کو تعظیم دیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ انھیں نذر سے معاف کیا جائے۔ نواب وزیر نے ان شرائط کو منظور نہیں کیا۔ اس لیے غالب ان سے ملاقات کیے بغیر لکھنؤ سے رخصت ہو گئے۔ اس واقعہ سے غالب کی خودداری بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

مرزا غالب نے ایک بار اور اپنی خودداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ۱۸۴۲ء میں جیمس ٹامسن سکریٹری ہند دلی کالج کے معائنہ کو آئے۔ ان کی خواہش تھی کہ جس طرح شعبۂ عربی میں ایک معلم کام کر رہے ہیں، اسی طرح شعبۂ فارسی میں بھی ایک معلم ہونا چاہیے۔ صدر الدین خاں آزردہ نے اس جگہ کے لیے مرزا غالب، مومن اور مولوی امام بخش کا نام پیش کیا، چونکہ ان تینوں

میں مرزا غالب کی شہرت مسلّم ہو چکی تھی، اس لیے مسٹر ٹامسن نے سب سے پہلے مرزا غالب کو انٹرویو کے لیے طلب کیا۔

مرزا غالب اپنی پالکی میں سوار ہو کر سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے، اور اس بات کے منتظر رہے کہ سکریٹری صاحب ان کے استقبال کو آئیں۔ جب مرزا صاحب کے اندر پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو ٹامسن صاحب نے ایک جمعدار کو تاخیر کا سبب معلوم کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مرزا غالب نے جواب دیا کہ حسب دستور ٹامسن صاحب میرے استقبال کو آئیں۔

تب سکریٹری صاحب باہر نکل آئے اور مرزا صاحب سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو ایک رئیس کی حیثیت سے آپ کا استقبال کیا جائے گا مگر یہاں آپ ملازمت کے سلسلے میں آئے ہیں اس موقع پر ویسا برتاؤ نہیں ہو سکتا۔

مرزا غالب نے جواب دیا کہ میرا سرکاری ملازمت کرنے کا اس وجہ سے ارادہ تھا کہ میرے اعزاز میں اضافہ ہو، نہ کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے!

سکریٹری صاحب نے کہا۔ "ہم قاعدے سے مجبور ہیں"

تب مرزا غالب نے جواب دیا کہ۔ "تو پھر مجھ کو اس خدمت سے معاف کیا جائے"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے مکان واپس آ گئے۔

غالب کی خودداری ان کے مختلف اشعار سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ معشوق کے سامنے سر جھکانا اپنی خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں ۔۔۔ سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۔۔۔ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

غالب کسی غیر کا احسان بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیر درد ۔۔۔ زخم مثل خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

غالب کا یہ قول ہے کہ محبوب کے حصول کے لیے رقیب کا احسان لینا عشق پر داغ لگاتا ہے۔

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ۔۔۔ ہم کو تسلیمِ نکونامیٔ فرہاد نہیں

غالب کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ مرض کی حالت میں دوا کا بھی احسان لینا گوارا نہیں کر سکتے۔

درد منت کش دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

غالب کی خودداری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ بے جان اشیا میں بھی خودداری کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں۔

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم   اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

ان اشعار سے غالب کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اُردو شاعری میں جب کبھی خودداری کا ذکر آئے گا تو غالب کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگا۔ غالب اپنی خودداری کی بنا پر نرگسی شعرا کی محفل میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

میر انیس

(۱۲۱۶ھ   ۱۲۹۱ھ)

میر انیس کی شاعری میں خودداری گلاب کے پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی خودداری کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ پہلا سبب واضح طور پر یہ ہے کہ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آباو اجداد کا اصل وطن ہرات تھا۔ ان کے جد اعلیٰ میر امامی شاہجہاں کے عہد میں دہلی آگئے تھے۔ ان کو شاہی دربار میں ملازمت مل گئی اور تین ہزاری منصب بھی بخشا گیا۔ وہ اپنے عہد کے مشہور مرثیہ گو بھی تھے۔ اگرچہ ان کے بیٹے برات اللہ اور پھر برات اللہ کے بیٹے عزیز اللہ نے کوئی خاص ادبی شہرت حاصل نہیں کی۔ مگر عزیز اللہ کے بیٹے میر ضاحک دنیائے ادب میں شہرت کے حقدار ٹھہرے۔ خصوصاً غزل گوئی میں خاص نام پیدا کیا۔ سودا نے انھیں کو اپنے تلخ ہجو سے مجروح کیا ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب دورِ مغلیہ پر زوال آگیا تو میر ضاحک دہلی سے فیض آباد آگئے۔ میر ضاحک کے بیٹے میر حسن تھے جنھوں نے مثنوی سحر البیان لکھ کر غیر فانی شہرت حاصل کرلی۔ میر حسن کے بیٹے میر خلیق گزرے ہیں۔ انھوں نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ میر خلیق

کے بیٹے میر انیس ہیں۔ اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر انیس کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے رہا ہے۔ اس بنا پر ان کی رگ و پے میں خودداری کا عنصر دوڑ رہا تھا۔

میر انیس کی خود داری کا سبب ایک اور بھی ہے۔ انھوں نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ ایک بار کسی مشاعرہ میں غزل پڑھی جس نے ان پر باب شہرت وا کر دیا۔ میر خلیق کو اس کی خبر ہوئی۔ انھوں نے میر انیس سے پوچھا۔ کل رات کو کہاں گئے تھے۔؟ انھوں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ بیٹے کی غزل سننے کے بعد فرمایا کہ اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زورِ طبع صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ باپ کے حکم کے بموجب میر انیس نے غزل گوئی کی وادی ترک کر دی اور مرثیہ گوئی کے لالہ زار میں داخل ہو گئے۔ چونکہ میر انیس اہلِ بیت کی مدح کرتے تھے اس لیے فطری طور پر وہ غیور ہو گئے تھے۔ ان کی نظر میں اہلِ دنیا نہیں سماتے تھے۔ کیوں کہ وہ شہیدانِ کربلا کے ثنا خواں تھے۔

میر انیس نے اپنی زندگی میں کئی بار اپنی خود داری کا اظہار کیا۔ ایک بار نواب واجد علی شاہ کو خیال گزرا کہ شاہنامے کے طرز پر اپنے آبا و اجداد کی تعریف میں ایک مثنوی لکھوائیں۔ اس کام کے لیے چار شعرا کا انتخاب ہوا۔ برق، اسیر، مرزا مہدی قبول اور میر انیس۔ مگر انیس اس کام سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ جس نے اہلِ بیت کی مدح کی ہو وہ کسی بادشاہ کی مدح کے لیے کیوں کر قلم اٹھا سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی اودھ کی سلطنت ختم ہو گئی۔ اس طرح میر انیس کو اس کام سے نجات حاصل ہو گئی۔

ایک بار میر انیس کسی مجلس میں مرثیہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک رئیس مجلس کی صفوں کو چیرتے ہوئے منبر تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میر انیس کو ان کی یہ بے ادبی ناگوار گزری انھوں نے رعب دار آواز میں کہا:

> "بس وہیں بیٹھ جاؤ، ایک قدم آگے نہ بڑھانا۔" رئیس صاحب کو وہیں بیٹھ جانا پڑا۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر انیس کسی رئیس کو خاطر میں نہ لاتے تھے[1]۔

---

[1] یادگار انیس۔ امیر احمد علوی ص ۱۰۶

۱۸۷۱ء میں میر انیس نواب تہور جنگ کی طلبی پر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ مگر راستے کی تکان کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئے۔ جب کچھ صحت حاصل ہوئی تو مرثیہ پڑھا۔ یہیں کی مجلس میں ایک روز میر صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ جب وہ مرثیہ کے بارہ بند پڑھ چکے تو ان کو محسوس ہوا کہ سامعین توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ بیدل ہو گئے۔ انھوں نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور حسرت ناک آواز میں کہا "ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں" اس کے بعد انھوں نے مرثیہ پڑھنا بند کر دیا اور علالت کا بہانہ کر کے واپس آ گئے۔ [لہ]

اس واقعہ سے میر انیس کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

چوں کہ میر انیس کو حیدر آباد میں کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی، اس لیے اس کے بعد سر آسمان جاہ بہادر نے ان کو طلب کیا اور پانچ ہزار نذرانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر انھوں نے ایک شرط رکھی۔ شرط یہ تھی کہ میر صاحب کو اپنی ٹوپی کی جگہ حیدر آباد کی پگڑی باندھنا ہو گی۔ میر انیس نے یہ شرط قبول نہیں کی اور حیدر آباد جانے سے انکار کر دیا۔ [سلہ]

میر انیس نے ایک بار اور حیدر آباد میں اپنی خودداری کا ثبوت دیا۔ جب وہ کسی مجلس میں مرثیہ پڑھ رہے تھے، اس وقت حیدر آباد کے ایک رئیس اعظم وہاں تشریف لے آئے، ان کی آمد پر اہل مجلس ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور ان کو منبر کے قریب جگہ دی۔ مگر میر انیس تعظیم کے لیے نہیں کھڑے ہوئے۔ انھوں نے صرف بسم اللہ کہا رئیس صاحب کو میر انیس کا یہ رویہ ناگوار گزرا۔ انھوں نے اپنے مصاحبین کو اشارہ کر دیا کہ انیس کے مرثیے کی تعریف نہ کی جائے۔ میر انیس کو اس کا اندازہ ہو گیا۔ انھوں نے پہلے چند رباعیاں پڑھیں، پھر ایک سلام پڑھا۔

لہ یادگار انیس۔ امیر احمد علوی ص ۹۹

سلہ ،، ،، ص ۹۹

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے　　اُڑ گیا جب رنگِ رخ سے استخواں پیدا ہوئے

اسی سلام میں ایک شعر بہت چھپتا ہوا تھا۔ اس لیے میر انیس نے ان رئیس کو مخاطب کر کے کہا کہ سنیئے آپ کے سننے کا شعر ہے :

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں　　خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

اس شعر پر وہ رئیس تعریف کرنے لگے۔ اس کے بعد میر انیس نے دو شعر اور پڑھے، پھر سارا مجمع ان پر داد و تحسین کے پھول برسانے لگا۔ [1]

حیدر آباد ہی میں میر انیس نے ایک بار اور اپنی خودداری کا ثبوت دیا۔ نواب تہور جنگ کی طلبی پر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہ مرثیہ پڑھنے کے بعد منبر سے نیچے اتر آئے اور احباب سے گفتگو کرنے لگے اتنے میں کوتوال شہر آئے اور میر انیس سے کہا کہ مختار الملک سر سالار جنگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میر انیس نے اس کا جواب نہ دیا۔ کوتوال شہر نے دوبارہ یہی بات کہی۔ اس بار بھی انیس خاموش رہے۔ کوتوال شہر سمجھے کہ انیس کچھ اونچا سنتے ہیں، اس لیے انھوں نے قریب آکر بلند آواز سے کہا۔ اس بار میر انیس نے کہا کہ "ہمدرد دکر رہا ہے۔" اس کے بعد وہ اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے۔ نواب تہور جنگ کو بھی اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی، چناں چہ انھوں نے رات کے کھانے پر میر انیس سے اس عدم توجہی کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کا مہمان ہوں۔ شرفا کے آداب کے مطابق کوتوال شہر کو آپ سے گفتگو کرنا چاہیے تھا اور آپ ہی کے ذریعہ ملاقات کا وقت مقرر کرنا چاہیے تھا۔ [2]

ایک بار میر انیس لبِ سڑک بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک رئیس قریب سے اپنی سواری پر گزرے۔ جب انھوں نے میر انیس کو دیکھا تو کوچوان کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کی رفتار دھیمی کر دے۔ ان کا مقصد تھا کہ وہ میر انیس کو سلام کر لیں، مگر میر انیس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

---

[1] یادگارِ انیس امیر احمد علوی ص ۱۰۱

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۱۰۹

اس طرح ان رئیس کو سلام کرنے کا موقع نہ ملا۔ جب ان رئیس کی گاڑی گزر گئی تو انھوں نے ایک شخص سے فرمایا:

"اس شخص کی صورت سے مجھے نفرت ہے۔ اس نے سلطنت سے بے ایمانی کی اور ہزاروں بے گناہوں کی گردنوں پر چھری پھیری ہے۔ میں کیا ہوں، رحمتِ خدا نے بھی ان لوگوں کی طرف سے منہ پھیر لیا ہے۔" [1]

میر انیس کی خودداری کا ایک اور واقعہ مشہور ہے:

"ایک دن وہ ماہِ رمضان میں حکیم تحسین کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ ایک رئیس ان سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مگر انیس نے منہ پھیر لیا۔ ایک شخص نے ان کو توجہ دلائی کہ فلاں رئیس امیدوارِ سلام ہیں۔ میر انیس نے دوسری طرف منہ پھیر کر کہا "کہاں ہو" تب اس نے رئیس کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ "وہ ہیں" میر انیس نے اس بار بھی دوسری طرف منہ پھیر لیا اور بولے "کہاں" اس کہاں کہاں سے وہ رئیس صاحب شرمندہ ہو گئے اور ان سے ملنے کا خیال ترک کر دیا۔" [2]

ان سارے واقعات سے میر انیس کی خودداری واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل میر انیس نے ساری زندگی خودداری کے ساتھ بسر کی۔ اسی خودداری کی جھلکیاں ہم کو ان کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ چوں کہ انیس شاہِ کربلا کی مدح سرائی کرتے ہیں، اس لیے ان کی نظر میں شاہِ دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اسی بنا پر وہ فرماتے ہیں:

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے ۔۔۔ سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

اسی خیال کی گونج مندرجہ ذیل شعر میں سنیے:

جز خدا جھکتے نہیں ہم بادشاہ کے سامنے ۔۔۔ ہاتھ پھیلائے تو نگر کیا گدا کے سامنے

---

[1] یادگارِ انیس - امیر احمد علوی - ص ۱۰۹

[2] " " " ص ۱۰۹ و ۱۱۰

میر انیس طلب کے خلاف ہیں :

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو — کبھی جو ہو گیا پھیرا مدا ثنا کے چلے

میر انیس کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔

نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیس — فقیری میں بھی دل تونگر رہے

میر انیس کی نظر میں مخمل و دیبا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو — اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

میر انیس امرا کی محفل سے گریز کرتے ہیں اور کنج عزلت پسند کرتے ہیں :

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر — رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے

انیس کے کنج عزلت میں امیروں کا گزر نہیں ہے :

فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا — امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

میر انیس اتنے خوددار ہیں کہ وہ ہر حال میں اپنی بات بالا رکھنا ضروری سمجھتے ہیں :

خدا بات رکھے جہاں میں انیس — یہ دن ہر طرح سے گزر جائیں گے

ان اشعار سے میر انیس کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم ان کو بھی ایک نرگسی شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

داغ

(۱۲۴۶ھ — ۱۳۲۲ھ)

نواب مرزا داغ دہلوی کی شاعری میں خودداری کی کرنیں نہایت تابناکی کے ساتھ چمک رہی ہیں۔ اس کا سبب ان کی خاندانی برتری اور اعلیٰ ماحول ہے۔ داغ کے والد نواب شمس الدین خاں لوہارو کے جاگیردار نواب ضیاء الدین خاں کے بھائی تھے۔ داغ کی عمر جب چھ سات برس کی تھی تو ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے ان کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ ظفر کے ساتھ عقد ثانی کر لیا اور شوکت محل کا خطاب حاصل کیا۔ داغ اپنی ماں کے ساتھ لال قلعہ میں پہنچ گئے، جہاں ان کی

آنکھوں نے اعلیٰ ماحول دیکھا۔ غرضیکہ داغ دیگر شعرا کے مقابلہ میں خاندانی عظمت کے لحاظ سے بلند تھے۔ اس بلندی نے ان کی شخصیت کے دامن میں خودداری کے صد آفتاب جڑ دیے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد داغ رام پور آگئے۔ یہاں نواب یوسف علی خاں نے ان کی بہت قدر کی، اور نواب کلب علی خاں کا مصاحب مقرر کردیا۔ اس کے علاوہ داروغہ اصطبل کی خدمت بھی سپرد کی۔ اب داغ رام پور میں آرام کی زندگی گزارنے لگے۔ اسی لیے وہ رام پور کو آرام پور کہنے لگے۔ مگر ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے ان کو رام پور ترک کرنا پڑا۔

داغ ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اس دربار سے ان کو مقرب السلطان بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ فصیح الملک کا خطاب عطا ہوا۔ حیدرآباد میں داغ ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے۔ اس کے بعد ان کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار ہو گئی۔ آخر میں پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئی۔ بقول ڈاکٹر رام بابو سکسینہ:

"کسی اُردو شاعر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اس قدر عزت اور قدر و منزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہوگی۔"[۱]

اسی عزت و قدر و منزلت کی بنا پر داغ کی شاعری میں خودداری کے ماہ و انجم جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

داغ کی شاعری کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے مزاج میں خودداری داخل ہو گئی تھی۔ چوں کہ داغ ہر جگہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کے دیگر شعرا کی طرح انھوں نے محبوب کی خوشامد نہیں کی۔ چناں چہ داغ تیوری پر بل ڈال کر کہتے ہیں:

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے ۔۔۔ عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

۱؎ تاریخ ادب اُردو۔ رام بابو سکسینہ۔ ص ۳۶۸

یہ انداز بیان بجز داغ کے اور کس کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ داغ بذات خود اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس کے علاوہ معاشی لحاظ ور معاشرتی اعتبار سے بلند و برتر تھے۔ داغ کا اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے:

بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا　　　　وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا

داغ کافر صنم کو کچھ نہیں سمجھتے، اس لیے وہ اگر ان کا دشمن ہے تو ہوا کرے داغ محبوب کی پروا نہیں کرتے ہیں:

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں　　　　جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

محبوب سے بے نیازی کا اظہار داغ نے اس شعر میں بھی کیا ہے:

دُنیا میں وضعدار حسیں اور بھی تو ہیں　　　　معشوق اک نہیں ہو تمہی اور بھی تو ہیں

داغ کی شان مندرجہ ذیل شعر میں بھی ملاحظہ فرمایئے:

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں　　　　آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

داغ نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی محبوب سے خودداری کا اظہار کیا ہے:

اب خدا چاہے تو میں تم کو نہ چاہوں ہرگز　　　　پھر یہ تقصیر ہو مجھ سے تو سزا دو مجھ کو

داغ کی خودداری اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ محبوب انھیں جلائے اور وہ اس کو نہ جلا سکیں۔

در پردہ تم جلاؤ، جلاؤں نہیں جو خوش　　　　میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

داغ نے اس شعر میں بھی نہایت شان کے ساتھ اپنی خودداری پیش کی ہے:

کیوں داغ کا نام آتے ہی نفرت ہوئی تم کو　　　　اک شخص ہے وہ تم اسے سمجھے ہوئے کیا ہو

داغ کے یہاں قدم قدم پر خودداری کے اشعار ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

رنجش مری بڑھ کر ہے تمھاری خفگی سے　　　　میں جان سے بیزار ہوں تم مجھ سے خفا ہو

مندرجہ ذیل شعر میں تو داغ نے علانیہ اپنے رئیس زادہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے:

دبا کے کیا ہے سُنے وہ جو آپ کی باتیں　　　　رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں

داغ نے جس ٹھسک کے ساتھ اس موقع پر اپنے محبوب سے گفتگو کی ہے اس ٹھسک

سے تو غالب نے بھی اپنی ڈومنی سے گفتگو نہ کی ہوگی۔

غرضیکہ داغ کے یہاں جس انداز کے خودداری کے اشعار ملتے ہیں اس انداز کے میر اور غالب کے دیوان میں بھی مشکل سے ملیں گے۔ جس طرح غالب یہ کبھی نہیں بھولتے تھے کہ ان کا خاندانی تعلق فریدوں سے ہے، اسی طرح داغ کبھی یہ فراموش نہیں کرتے تھے کہ ان کا تعلق لال قلعہ سے رہا ہے۔ اسی لیے داغ کبھی محبوب کو خاطر میں نہیں لاتے درحمل داغ کی خودداری کا درجہ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ داغ کے اس مخصوص نرگسیت کے خول میں شور بلند ہے جو ہمارے کانوں کو گنگ کر دیتا ہے۔

حالی

(۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء)

دورِ جدید کے شعرا کے یہاں بھی خودداری پائی جاتی ہے، چناں چہ حالی کی شخصیت سے خودداری کی دھیمی دھیمی آنچ نکلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حالی خاندانی اعتبار سے بلند تھے۔ حالی کا شجرۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ اسی خاندان میں ایک بادشاہ میرک علی شاہ گزرے ہیں جو ہرات کے فرماں روا تھے اور بہت بڑے علم دوست تھے۔ ان کے بیٹے خواجہ ملک علی نے حکومت ترک کر کے ہندوستان کی اقامت اختیار کی۔ غیاث الدین بلبن ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور ان کو پانی پت میں جائداد بخش دی اسی خاندان کے ایک بزرگ خواجہ ایزد بخش انصاری گزرے ہیں۔ مولانا حالی پانی پتی انھیں کے پسر ارجمند تھے۔ حالی کا خاندانی شجرہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان علو ئے خاندان حاصل تھا۔ حالی کی خودداری کا ایک یہ سبب بھی ہو سکتا ہے۔

حالی کی زندگی کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے اپنی عمر خودداری کے ساتھ گزاری۔ حالی اپنے عہد کے بہت بڑے عالم و فاضل انسان تھے اور ملک کے گوشے گوشے میں ان کے قدردان موجود تھے۔ خصوصاً جب وہ حیدرآباد تشریف

لے گئے تو ان کی کافی قدر ہوئی۔ حالی اگر چاہتے تو وہاں ایک اعلیٰ ملازمت حاصل کر سکتے تھے مگر ان کی خودداری نے اس کو پسند نہیں کیا۔

حالی کی خودداری کا ذکر صالحہ عابد حسین نے "یادگارِ حالی" میں کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ ۱۹۰۴ء میں حالی کو شمس العلما کا خطاب ملا، مگر یہ خطاب ان کے لیے بلائے جان ثابت ہوا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو ایک خط میں لکھا:

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لیے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہیں ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لا محالہ وہاں جانا پڑے گا ...... بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں۔"[1]

اس واقعہ سے حالی کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ یہ بات حالی کی شان کے خلاف تھی کہ وہ انگریزی افسروں سے ملاقات کریں۔

حالی کی شاعری کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کے یہاں میر، آتش اور داغ کی جیسی خودداری تو نہیں ملتی ہے مگر ان کی شخصیت کے ساز سے خودداری کے ہلکے ہلکے سُر ضرور نکلتے ہیں۔ مثلاً حالی فرماتے ہیں:

چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منھ میں زباں ہے اب ۔۔۔ مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب

چوں کہ حالی خوددار انسان ہیں اس لیے وہ ضبط نہیں کر سکے اور جواب دینے کے لیے مجبور ہو گئے۔

حالی کی خودداری ان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ بھی اپنی طبیعت کچھ نہ کچھ بدل دیں۔ کیوں کہ ان کے محبوب کی طبیعت بھی بدل گئی ہے:

---

[1] یادگارِ حالی۔ صالحہ عابد حسین۔ ص

قلق انھیں نہیں گردوستوں سے چھٹنے کا　　طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ بدلتی جاتی ہے

حالی نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی زبان کھولنے کی دھمکی دی ہے، کیوں کہ وہ ایک خوددار انسان ہیں۔

ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے　　اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

اگرچہ حالی کی خودداری نرگسیت کے اعتبار سے زیادہ اہم نہیں ہے، تاہم اس کو ہم نظرانداز بھی نہیں کر سکتے۔

مولانا محمد علی جوہر

(۱۸۷۸ء — ۱۹۳۱ء)

مولانا محمد علی جوہر کا تعلق ایک خوش حال گھرانے سے تھا۔ ان کے دادا علی بخش نے غدر کے دوران انگریزوں کی مدد کی تھی۔ اس کے صلے میں ان کو انگریزوں نے مراد آباد میں ایک جاگیر عطا کی تھی۔ مولانا محمد علی کے والد عبدالعلی خاں صاحب کو نواب یوسف علی خاں ناظم والئی رام پور نے اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا تھا اور اسٹیٹ میں ان کو ایک خاص وقار حاصل تھا اس لیے جوہر نے ایک باعزت ماحول میں آنکھ کھولی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں خودداری داخل ہو گئی تھی۔

مولانا محمد علی میں خودداری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ بے حد ذہین تھے۔ ان کی ذہانت کے جوہر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کھلے۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے بی۔ اے کا امتحان دیا اور سارے صوبے میں اول آئے۔ ان کو زبان پر عبور حاصل تھا۔ علی گڑھ کے دوران تعلیم انھوں نے "علی گڑھ منتھلی" میں ایک مضمون لکھا جس کی تعریف علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر موریس نے بھی کی۔ جب آکسفورڈ میں طالب علم تھے تو انھوں نے شیکسپیر کے ڈرامے "میکبتھ" پر ایک عالمانہ مضمون لکھا جس کی اس قدر شہرت ہوئی کہ ان کو "آکسفورڈ سوسائٹی" کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ان کی انگریزی کی تعریف لارڈ منٹو اور لارڈ میکڈانلڈ نے بھی کی۔ اس کے علاوہ ایچ۔ جی۔ ویلس اور برنارڈ شا جیسے عالم و فاضل مولانا محمد علی کی انگریزی دانی کے معترف تھے۔ دراصل ان کی بے پناہ لیاقت

اور صلاحیت نے ان کے قلب میں خودداری کی آگ روشن کردی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر نے اپنی زندگی خودداری کے ساتھ گزاری اور انھوں نے مختلف مواقع پر خودداری کا مظاہرہ کیا۔ رئیس احمد جعفری نے چھندواڑہ کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے ان کی خودداری واضح ہو جاتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے برٹش گورنمنٹ نے مسز لبسنٹ اور دیگر سیاسی لیڈروں کو رہا کر دیا مگر مولانا محمد علی ہنوز نظر بند تھے۔ کچھ ہندوستانی رہنماؤں نے دوالتہ پر زور ڈالا کہ علی برادران بھی رہا کر دیے جائیں، مگر گورنمنٹ نے انکار کر دیا۔ اس دوران میں شیخ عبدالمجید صاحب سپرنٹنڈنٹ خفیہ پولیس مولانا محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اگر وہ اس کا تحریری بیان دے دیں تو ان کو رہائی حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر مولانا محمد علی نے سپرنڈنٹ صاحب کی اس درخواست کو ٹھکرا دیا۔ کیوں کہ ان کی غیرت نے دب کر صلح کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس ناکامی کے بعد مسٹر جناح، مسٹر مظہرالحق، مہاراجا صاحب محمود آباد وغیرہ درمیان میں پڑے، مگر گورنمنٹ نے سماعت نہیں کی۔ دوسری طرف مولانا محمد علی پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں پانچ برس کی قید بھگتنا پڑی۔ انھوں نے اپنی قید کے پانچ سال نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ گزارے مگر اپنے آئینۂ خودداری پر ضرب نہیں آنے دی۔[1]

جس طرح مولانا محمد علی کی زندگی میں خودداری کی جلا پائی جاتی ہے، اسی طرح ان کی شاعری میں خودداری کی بجلیاں کوندتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ دراصل جوہر کی ابتدائی شاعری ہی میں ہم کو خودداری کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ انھوں نے ۱۸۹۶ء میں ایک شعر کہا تھا۔

خوش قسمتی کے آگے جھکایا نہ اپنا سر — اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

اس دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو خوش قسمتی کو ٹھکرا سکتے ہیں۔ دراصل مولانا محمد علی جوہر کی ذات عام انسانوں سے جدا ہے اس لیے وہ خوش قسمتی کے سامنے بھی اپنا سر جھکانا پسند نہیں کرتے۔

جوہر نے مندرجہ ذیل شعر میں تو کھل کر اپنی خودداری کا اظہار کر دیا ہے۔

---

[1] سیرت محمد علی، رئیس احمد جعفری ص ۶۷

جوہر اور صاحب دربار کی خوشامد کیا خوب　　عرش و کرسی پہ گڑیں ہے ترے درباری کا

جوہر کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ قاتل کو بھی خوش کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

خوش کرے کو قاتل کے ہم اور اشک بہائیں　　ہاں زخم جگر ہنس کے اسے شاد کریں گے

جوہر کی خودداری کی آخری حد یہ ہے کہ وہ نزع میں بھی تمکین قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

ہے بات تو جب نزع میں تمکیں رہے قائم　　مقتل ہے دلا! رقص کی محفل تو نہیں ہے

ان اشعار سے جوہر کی خودداری کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ خودداری کے لحاظ سے جوہر کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ہم ان کو میر، غالب، آتش اور داغ وغیرہ کے ساتھ بٹھا سکتے ہیں۔

ریاض خیرآبادی

(۱۸۵۳ء　　۱۹۳۴ء)

ریاض خیرآبادی کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ اس امر کو منکشف کرتا ہے کہ ان کے یہاں خودداری کے جراثیم موجود تھے۔ ان کی خودداری کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔

ریاض خیرآبادی کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ مولوی سبحان اللہ صاحب اور ریاض خیرآبادی میں اتنے گہرے تعلقات تھے کہ دونوں ایک ہی خاندان کے فرد معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے مولوی سبحان اللہ کو ریاض خیرآبادی کے بارے میں کافی معلومات حاصل تھیں۔ وہ ریاض خیرآبادی کے خاندان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"سید ریاض احمد صاحب نسباً سید حسینی ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد ہندوستان میں آنے سے پہلے ایران میں کرمان کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ان کے مورث علاؤالدین کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ یہاں بادشاہ کی فوج میں کوئی عہدہ بھی رکھتے تھے ان کی فوج ایک مہم سر کرنے کے لیے بھیجی گئی وہاں فتح حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ چند ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور ضلع بارہ بنکی و سیتاپور کے مختلف مقامات پر آباد ہو گئے"[۱]۔

---

[۱] رند پارسا۔ رئیس احمد جعفری۔ ص ۵۸

مولوی سبحان اللہ کا یہ بیان اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ریاض خیرآبادی کے آباد و اجداد ایران کے باشندے تھے۔ جب وہ لوگ ہندوستان آئے تو بادشاہ علاءالدین کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس لحاظ سے ریاض کو خاندانی برتری حاصل تھی۔

رئیس احمد جعفری نے بھی ریاض کی خاندانی عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ریاض کے خاندان کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ریاض صاحب کے آبائے کرام میں اکثر حضرات سلاطین روزگار کی جانب سے معزز عہدوں پر مامور ہوتے رہے۔ چناں چہ خیرآباد کا عہدۂ قضا آپ ہی کے خاندان سے مختص تھا جس کے صلے میں شاہانِ وقت کی طرف سے جاگیریں بھی عطا ہوئی تھیں جو کم و بیش غدر کے زمانے تک باقی رہیں۔ خیرآباد کا محلہ قضیارہ اس عہد کی یادگار ہے۔ ریاض کے والد ماجد سید طفیل احمد صاحب بڑے پائے کے عالم تھے۔ آپ کا نسب حضرت مخدوم شیخ سعد رحمۃ اللہ کے خلیفہ حضرت قاضی سید بخش رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے حضرت سید شاہ شجاع کرمانی تک پہنچتا ہے۔ حضرت قاضی سید بخش کا مزار مکانِ ریاض سے متصل ہے انھیں کے زیرِ سایہ بزرگانِ ریاض محوِ خواب ہیں۔" [۱]

انسان جب اپنی خاندانی برتری کو محسوس کرتا ہے تو اس میں خودداری کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ خود کو دوسروں سے افضل و اعلیٰ تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض بھی اپنی ہستی کا عرفان رکھتے تھے اور خودداری کے جذبے کو اپنے دل میں پروان چڑھائے تھے۔

ریاض کی خودداری کا ایک اور سبب ان کا کامیاب عشق ہے۔ درحقیقت ریاض کی زندگی بڑی رومان پرور تھی۔ عشق ان کی رگ و پے میں خون بن کر رواں دواں تھا۔ ان کو عشق میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اپنے عشق کے قصے بذاتِ خود بیان کیے ہیں۔ وہ اپنے پہلے رومان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ بچپن میں کسی رئیس کے یہاں رہتے تھے۔ چوں کہ خاندانی روابط تھے

---

[۱] رندِ پارسا۔ رئیس احمد: ۶۰

اس لیے ان کے یہاں کی عورتیں ان سے پردہ نہیں کرتی تھیں لیکن دو ناکتخدا لڑکیاں پردۂ حجاب میں مستور رہتی تھیں۔ ان میں سے کسی ایک لڑکی پر ریاض عاشق تھے۔ ایک روز گھر کے مرد علاقے میں چلے گئے تھے اور بیبیاں کسی تقریب میں شرکت کے لیے چلی گئی تھیں، ریاض نے سوچا کہ یہ تو سنہری موقع ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ بہاں چودہ رات کی تاریکی میں اس کمرہ میں داخل ہو گئے جہاں وہ لڑکی محو خواب تھی۔ انھوں نے اس کے رخ گلگوں سے آنچل سرکایا۔ لڑکی بیدار ہو گئی۔ وہ لڑکی چیخنے والی ہی تھی کہ ریاض نے اپنا نام بتا دیا۔ وہ لڑکی خود ریاض پر اُن سے زیادہ فریفتہ تھی۔ مگر ریاض نے شرعی حدود سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اس لڑکی نے بھی اس بات پر زور دیا کہ عقد ہو جائے۔ اس کے بعد ریاض نے اس لڑکی سے شادی کی کوشش کی۔ مگر ان کے والدین اس بات پر راضی نہیں ہوئے اور ان کی شادی دوسری جگہ کر دی۔

بہرحال اس واقعہ سے یہ امر تو واضح ہو جاتا ہے کہ محبوبہ خود ریاض کی محبت میں گرفتار تھی۔ ایک تو ریاض بذات خود خوش رو تھے۔ پھر محبوبہ ان پر جان صدقے کرنے کے لیے آمادہ تھی۔ ایسی صورت میں ریاض میں خودداری کے جذبے کی نمود بالکل فطری ہے۔

ریاض نے شادی کے بعد ایک اور عشق کیا۔ اس کی ابتدائے عشق کا نقشہ رئیس احمد جعفری نے جن حسین الفاظ میں پیش کیا ہے، ان کا تقاضا ہے کہ وہی عبارت یہاں درج کر دی جائے۔

> "ایک شریف غیر مسلم گھرانا ہے۔ ریاض وہاں آتے جاتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ گھر کیا ہے چمنستان ہے، سبد گل ہے۔ باغ رضواں ہے، ایک گل رعنا سے آنکھ لڑتی ہے اور ملاقات بے تکلفی میں، بے تکلفی اُنس میں، اُنس محبت میں اور محبت عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایک طرف عشق ہے جو چاک گریباں اور بادہ پیمائی پر آمادہ ہے۔ دوسری جانب حُسن ہے جو ایک گل نودمیدہ کی طرح کھل رہا ہے۔ باغ ہستی کی ہوائیں اس میں تازگی پیدا کر رہی ہیں۔ حُسن نہ احساسِ خودی سے محروم ہے نہ شوقِ جلوہ آرائی سے وہ اپنی بے

پہناہیوں کی پرستش چاہتا ہے۔ اپنی گہرائیوں کا اعتراف چاہتا ہے۔ اپنی انفرادیت پر نازاں بھی ہے اور مغرور بھی۔" [1]

ریاض اس ہندو لڑکی پر شیدا تھے، اور وہ ہندو لڑکی بھی ریاض کی دلدادہ تھی۔ مگر تفریق مذہب سدِ سکندری کی طرح حائل تھی۔ ریاض یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ کوئی گناہ کریں۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اس کا خاندان ان کی دیوانگی کی بناء پر رُسوا ہو۔ اس لیے ریاض نے موقع کی نزاکت پر غور کرتے ہوئے ایک نئی راہ نکالی۔ وہ ایک طویل سفر کے لیے نکل گئے تاکہ محبوبہ کا خیال ان کے دل سے محو ہو جائے اور ان کی یاد محبوبہ کے دل سے مٹ جائے۔

ریاض اپنے طویل سفر سے کئی ماہ کے بعد واپس آئے۔ ان کے آگے کی داستان رئیس احمد جعفری کی زبان سے سُنیے:

"ریاض (کئی مہینے کے بعد واپس آئے، دریار تک پہنچے۔ معلوم ہوا دق کی شکایت ہے۔ معالج جواب دے چکے ہیں۔ آگے بڑھے اور حریم ناز میں پہنچ گئے۔ وہی چہرہ جو اپنی تازگی میں پھولوں کو، جو اپنی تابانی میں ماہِ نیم ماہ کو جو اپنی شادابی میں گل تر کو شرماتا تھا، سوکھ کر ایک بے رونق ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں، ریاض کہتے ہیں، اس مختصر ملاقات نے حُسن کی حالت "دگرگوں" کر دی۔ چند لمحوں میں یہ ملاقات ختم ہوئی اور ریاض واپس آ گئے۔ دوسرے روز معلوم ہوا حیا اور عصمت کی پتلی اس جہان آرزو سے ناکام و نامراد اُٹھ گئی۔" [2]

یہ واقعہ بھی اس راز کو منکشف کرتا ہے کہ ریاض کی محبوبہ ان پر بُری طرح فریفتہ تھی یہی وجہ ہے کہ اس نے ہائے ریاض پر جان دے دی۔ انھیں حالات میں انسان خودداری کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض کا دل بھی خودداری کا آئینہ نظر آتا ہے۔

---

[1] رندِ پارسا۔ رئیس احمد جعفری ص ۸۱-۸۰

اس کے بعد ریاض نے تیسرے عشق کی منزل میں قدم رکھا۔ اس بار انھوں نے ایک ہندو طوائف سے محبت کی۔ جو "کوٹھے والی" کے نام سے موسوم تھی۔ چوں کہ ریاض شرعی احکام کے پابند تھے، اس لیے انھوں نے اس طوائف کے سامنے تین شرطیں پیش کیں۔

یعنی اول، تبدیل مذہب۔ دوئم توبہ، سوئم نکاح۔

وہ ہندو طوائف ریاض کے عشق میں اس قدر دیوانی تھی کہ اس نے ریاض کی تینوں شرطیں قبول کریں۔

غرضیکہ ریاض کی خاندانی برتری اور ان کے کامیاب عشق نے ان کی ذات میں خودداری کے شعلے بھڑکا دیئے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف اوقات پر خودداری کا اظہار کیا ہے ان کی خودداری کے بارے میں رئیس احمد جعفری تحریر فرماتے ہیں:

"امرا کی حویلیوں، بادشاہوں کے درباروں، زرداروں کی کوٹھیوں اور ارباب جاہ و ثروت کے دولت کدوں کا طواف کرتے وہ کبھی نہیں دیکھے گئے"۔[1]

ایک جگہ رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے کہ جب ریاض کا پریس بند ہو چکا تھا اور اخبار نہیں نکلتا تھا، اس وقت ان کو صرف محمود آباد اسٹیٹ سے چالیس پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا اور اسی میں سارے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ان کے بھائی کافی مالدار تھے۔ نیاز صاحب کو سرکاری پنشن ملتی تھی۔ اس کے علاوہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بھوپال اسٹیٹ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے تھے۔ وہاں سے بھی ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ اس طرح ان کی مستقل آمدنی چار سو روپیہ ماہوار کے قریب تھی۔ ان کے دوسرے بھائی فیاض صاحب کی بھی کافی آمدنی تھی۔ مگر انھوں نے کبھی اپنے بھائیوں سے مدد کی درخواست نہیں کی۔ یہ ان کی خودداری کی بین مثال ہے۔

ریاض کی خودداری کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ انھوں نے کسی کو اپنا شاگرد نہیں بنایا۔ اس لیے عام طور سے اساتذہ کو اپنے شاگردوں سے جو نذرانہ مل جاتا تھا اس سے بھی ریاض محروم تھے۔ ریاض کبھی کبھی زبانی یا بذریعہ خط و کتابت لوگوں کو مشورہ دیتے تھے، مگر ان سے کبھی زر و مال کے

---

[1] رند پارسا۔ رئیس احمد جعفری ص ۴

کے طلب گار نہیں ہوئے۔

ریاض کی خودداری کے سلسلے میں رئیس احمد جعفری نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔
ان کا قول ہے کہ:

جس دوران میں ریاض صاحب کا قیام محمود آباد میں تھا، اس وقت ریاست کے سیاہ و سفید کے مالک ڈپٹی حبیب اللہ صاحب تھے۔ ان سے اور ریاض سے ان بن رہتی تھی۔ چنانچہ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:۔

"ڈپٹی صاحب سے اور ریاض سے نہیں بنتی تھی۔ ریاض صاحب کا وظیفہ بند ہو گیا ہوتا۔ اگر شخصی طور پر مہاراجہ مرحوم بار بار اسے اپنی نگاہ میں نہ رکھتے ریاض نے اپنی خودداری اور وقار کو قائم رکھتے ہوئے ڈپٹی صاحب کو رام کرنے کی کوشش کی لیکن ڈپٹی صاحب کی روش قائم رہی۔ ایک بار مہاراجہ صاحب نے ریاض صاحب کے حسب طلب انہیں تین سو روپے مرحمت فرمائے۔ ریاض کو خط لکھ کر دیا کہ وہ ڈپٹی صاحب سے رقم وصول کر لیں۔ ریاض صاحب نے اس رقم سے ہاتھ اٹھا لیا لیکن ڈپٹی صاحب کے پاس نہیں گئے"[۱]

ریاض نے اپنی خودداری کا ایک واقعہ خود بیان کیا ہے۔ ریاض خیر آبادی کے ہمسنوئی وسیم خیر آبادی سیتاپور سے ایک ادبی ماہوار رسالہ "گلچین" نکالتے تھے، کچھ عرصہ کے بعد یہ رسالہ لکھنؤ سے نکلنے لگا۔ پھر اس کا دفتر لکھنؤ سے گورکھپور منتقل ہو گیا، جس کے نگراں ریاض خیر آبادی تھے۔ اس زمانے میں ریاض صاحب کا یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر ماہ کسی استاد کا ایک مصرع طرح دیتے تھے اور شعرائے کرام کو اس طرح پر غزل کہنے کے لیے مدعو کرتے تھے۔ یہ غزلیں گلچین میں شایع ہوتی تھیں۔

ایک بار امیر مینائی کا مندرجہ ذیل مصرع طرح کی حیثیت سے دیا گیا۔

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

اس مصرع پر ہندوستان کے مشہور شعرا نے گرہ لگانے کی کوشش کی اور غزلیں

۱۔ رند پارسا۔ رئیس احمد جعفری۔ ص ۵۵

کہیں۔ اس سلسلہ میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں خسرو دکن نے بھی غزل کہی اور ان کے قلم سے ایک بے مثل مصرع نکل گیا جو سارے ہندوستان پر چھا گیا۔ وہ مصرع یہ تھا:

یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

اس کے بعد ہی خسرو دکن کے خانساماں ابراہیم صاحب نے ریاضؔ کو لکھا کہ:

"میں تمھارے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دوں گا، تم یہاں آنے کے لیے تیار رہو۔ بہت جلد اعلیٰ حضرت تمھیں یاد فرمائیں گے۔ اور تین مصرع طرح "گلچیں" کے لیے اعلیٰ حضرت نے مرحمت فرمائے ہیں، ان کو نمبروار شایع کرتے رہنا۔"

ریاضؔ صاحب کا قول ہے کہ ان کو "ہلکی تحریر" اور تم تم کی تکرار خط میں گراں گزری" اس لیے انھوں نے داغؔ دہلوی کو خط لکھا۔ انھوں نے رائے دی کہ آپ جواب میں یہ لکھیے کہ

"جب تک اُستاد اعلیٰ حضرت کی وساطت سے مصرعے نہ آئیں گے گلچیں اشاعت سے قاصر رہے گا۔"

اس واقعہ سے واضح طور پر ریاضؔ کی خودداری آشکار ہوتی ہے۔ رئیس احمد جعفری نے ایک اور موقع پر ریاضؔ کی خودداری پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ریاضؔ طبعاً بڑے غیور اور نازک مزاج تھے، اسی لیے وہ مواقع ملنے کے بعد بھی ریاستوں کی ملازمت سے احتراز کرتے تھے۔ ہمارے شعرا کا ایک بڑا طبقہ صرف ریاستوں ہی کی فیاضی اور ذرہ نوازی پر جی رہا ہے۔ ریاضؔ کے زمانے میں تو خاص طور پر ریاستیں شاعروں کی ملجا و ماوا بنی ہوئی تھیں۔ جس کا بھی ابنائے ہند سے جی گھبرایا، ایک انگڑائی لی اور کسی ریاست کا رخ کیا۔ ریاضؔ کے زمانے میں تمام مشہور شعرا کسی نہ کسی ریاست سے وابستگی رکھتے تھے۔ خود ان کے اُستاد امیر مینائی رام پور میں موجود تھے۔ اور بھی ان کے ذرائع تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بار بار متعدد ریاستوں

کی طرف سے انھیں پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے ہمیشہ بلطائف الحیل ٹال دیا۔ اس کی وجہ نہ تھی کہ انھیں روپے کی ضرورت نہ تھی۔ یا وہ ملازمت سے رو گرداں تھے۔ بات اصل یہ تھی کہ وہ دربار کی پابندیوں، وہاں کے آداب، طرز نشست اور غلامی سے نفور تھے۔ اسی لیے وہ گھاٹے اور ٹوٹے میں رہے۔[1]

چوں کہ ریاض نے اپنی زندگی خودداری کے ساتھ گزاری ہے اس لیے ان کی ذات کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ چناں چہ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

آ گئی چار ہی دن میں تری خو کو دل میں ... اب حسینوں سے بھی بڑھ چڑھ کے یہ کھاتا ہے داغ

ریاض نے واضح طور پر اس شعر میں کہہ دیا ہے کہ ان کے دل میں خودداری بیدار ہو گئی ہے۔ ایک اور شعر میں ریاض نے معشوق کے سلسلے میں خودداری کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے معشوق کو سجدہ کرنا یا اس کے سامنے سر جھکانا غیر مناسب ہے۔ بلکہ معشوق سے تو لطف اندوز ہونا چاہیے۔

یا ہیں تو ان بتوں کو گلے سے لگائیں ہم ... سجدے کریں کبھی نہ کبھی سر جھکائیں ہم

ریاض کی خودداری اس موقع پر ابھر آئی ہے۔ جب ان کو کوئی راستے سے اٹھاتا ہے۔ وہ ایک جگہ مست بیٹھے ہیں، کسی کو کیا حق ہے کہ وہ ان کو اٹھائے۔

دشمن کے گھر کی راہ ہے ان کی گلی نہیں ... بیٹھا ہوں میں یہاں سے مجھے کوئی کیوں اٹھائے

مندرجہ ذیل شعر میں تو ریاض نے کھل کر اپنی خودداری کا اظہار کر دیا ہے:

آپ ہوں یا آپ سے بڑھ کر کوئی
ہم نہیں تو اک زمانہ کچھ نہیں

اگرچہ ریاض کی خودداری میں بہت زیادہ چمک دمک نہیں ہے اس کے باوجود وہ اپنی خودداری کی بنا پر اردو کے نرگسی شعرا میں جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔

●

---

[1] رند پارسا۔ رئیس احمد جعفری۔ ص ۲۲۶

اقبال

(۱۸۷۵ء — ۱۹۳۸ء)

اقبال کی شاعری میں خودداری کے جلوے زہرہ و مشتری کی طرح تابندہ نظر آتے ہیں۔ ان کی خودداری کی دو قسمیں ہیں۔ ان کی شاعری میں پہلی قسم کی وہ خودداری پائی جاتی ہے جس کا تعلق خود ان کی ذات سے ہے۔ مگر اس قسم کی خودداری اس سے قبل کے شعرا کے یہاں بھی ملتی ہے۔ اس لیے وہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں دوسری خودداری وہ موجود ہے جس کا تعلق کائنات سے ہے۔ اس قسم کے تصورات میں اقبال نے خصوصی طور پر مسلم قوم کو اور عمومی طور پر بنی نوع انسان کو خودداری کی تعلیم دی ہے۔ اردو شاعری میں خودداری کی یہ ایک نئی آواز ہے۔

اقبال کی ذاتی خودداری کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ اقبال کا خاندان بہت اعلیٰ نہیں تھا۔ اقبال کے قدیم خاندانی لوگ سترھویں صدی عیسوی میں ایک برہمن نسل "گوت سپرو" سے تعلق رکھتے تھے اور مسری نگر میں آباد تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد باہر سے کوئی سید صاحب تشریف لائے، اقبال کے جدِ اعلیٰ نے اُن سید صاحب کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا۔ اور اس کے بعد وہ صالح کے نام سے موسوم ہوئے۔ سید صاحب نے اپنی دختر کی شادی بھی ان سے کردی۔ مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے ساری زندگی زہد و تقویٰ میں گزاری، اور بابا صالح کے نام سے موسوم ہوئے۔ جب ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ برپا ہوا اور کشمیر میں ظلم و استبداد کا آغاز ہوا تو بابا صالح کی اولاد میں سے ایک شخص شیخ محمد رفیق نے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی۔ شیخ محمد رفیق کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام شیخ نور محمد تھا اور دوسرے کا نام شیخ غلام قادر۔ شیخ نور محمد کے بیٹے ڈاکٹر اقبال تھے۔[۱]

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نومسلم تھے۔ اس لیے اقبال کے یہاں خودداری ملی

۱۔ ذکرِ اقبال۔ عبدالمجید سالک۔ ص ۷،۸

برتری کی بنا پر نہیں ہے۔

اقبال کے والد نور محمد صاحب غیر تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی والدہ امام بی بی صاحبہ بھی پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ اس لیے اقبال اپنے والدین پر بھی فخر نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ان کے باپ ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے یہاں پارچہ دوزی پر ملازم تھے، بعد میں شیخ نور محمد نے یہ ملازمت ترک کر دی اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی اعلیٰ پیشہ نہیں تھا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اقبال کے یہاں جو خودداری ملتی ہے وہ نسلی اور خاندانی برتری کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے دیگر اسباب ہیں۔

اقبال میں خودداری کی اعلیٰ تعلیم کی بنا پر پیدا ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے ان کی تعلیم کی طرف بہت توجہ کی۔ اقبال کی فطری ذہانت پر تعلیم نے جلا کر دی۔ پہلے اقبال نے مولوی میر حسن شاہ کے یہاں دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۸۸ء میں پرائمری، ۱۸۹۰ء میں مڈل اور ۱۸۹۲ء میں انٹرنس پاس کیا۔ وہ اتنے ذہین تھے کہ تینوں امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد اسی کالج سے انھوں نے ایف۔ اے کا امتحان بھی پاس کیا۔

۱۸۹۵ء میں بغرض حصول تعلیم اقبال لاہور تشریف لائے۔ اور گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ یہاں انھوں نے فلسفہ، انگریزی اور عربی اختیاری مضامین منتخب کیے۔ انھوں نے ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی اور عربی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی ان کو ملے۔ اسی درمیان میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ نے علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کر لیا اور لاہور کالج میں ملازمت اختیار کی۔ وہ اپنے عہد کے زبردست فلسفی تھے۔ اقبال نے موقع کو غنیمت جانا اور فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم۔ اے کر لیا اور یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس لیے ان کو پھر ایک طلائی تمغہ ملا۔ غرضیکہ اقبال میں ذاتی خودداری اعلیٰ تعلیم کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی۔

اس کے علاوہ انھوں نے دنیاوی حیثیت سے بھی کافی ترقی کی۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اقبال میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر بنا

دیے گئے جہاں وہ ۱۹۰۵ء تک کام کرتے رہے۔

۱۹۰۵ء میں اقبال حصول تعلیم کی غرض سے انگلینڈ تشریف لے گئے۔ انھوں نے کیمبرج یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور مغربی فلسفہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان کو اس یونی ورسٹی سے اخلاقیات میں ڈگری مل گئی۔ اس کے بعد وہ جرمنی تشریف لے گئے۔ اور میونک سے فلسفۂ ایران پر پروفیسر ہوان کی حسین وطرحدار بیٹی کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر لیا۔ پھر جب وہ جرمنی سے انگلینڈ واپس آئے تو بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد لاہور آ کر وہ وکالت کرنے لگے۔ اقبال نے اس قدر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی تھی کہ ان کی ذات میں خودداری کے صد آفتاب وماہتاب درخشندہ وتابندہ ہو کر داخل ہو گئے۔

اقبال کی خودداری کا ایک سبب ان کی شاعرانہ شہرت ہے۔ جب اقبال ایف۔ اے کے طالب علم تھے اس وقت انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ اور خط وکتابت کے ذریعہ داغ سے تلمذ حاصل کیا۔ اقبال مشاعروں سے گریز کرتے تھے۔ مگر لاہور میں ایک مشاعرہ شہزادہ مرزا ارشد گورگانی کی موجودگی میں ہوا۔ اس میں اقبال نے احباب کے اصرار سے ایک غزل پڑھی جس کا یہ شعر گورگانی نے بے حد پسند کیا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے ۔۔۔ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مرزا گورگانی اچھل پڑے اور کہنے لگے۔ اقبال اس عمر میں یہ شعر؟

اقبال نے ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی مشہور نظم "نالۂ یتیم" ترنم کے ساتھ پڑھی۔ جس نے ان کو فضائے شاعری میں اچھال دیا۔ ۱۹۰۱ء میں لاہور سے "مخزن" شیخ عبدالقادر کی ادارت میں نکلا۔ اس میں اقبال کی نظم "ہمالہ" شایع ہوئی جس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور اس نے ان کا سکہ بہ حیثیت شاعر عوام کے دل پر بٹھا دیا۔

جب اقبال انگلینڈ تشریف لے گئے تو وہاں انھوں نے فارسی میں شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان میں واپس آئے تو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اقبال نے مسلسل مشق ومہارت کی بنا پر اردو شاعری میں بلند ترین مقام حاصل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا فارسی کلام اسلامی ممالک تک پھیل گیا۔ اقبال اپنی زندگی ہی میں بین الاقوامی شہرت کے

مالک ہو گئے تھے۔ اس شہرت نے بھی ان کو خود دار بنا دیا۔

اقبال نے اپنی زندگی میں کئی بار خود داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی بیگم سے ترک تعلق کر لیا تھا۔ اس کے بعد شیخ گلاب دین کی لڑکی سے عقد کیا، مگر بعد میں ان کو اس کے چال چلن کے بارے میں بہت سے گمنام خطوط موصول ہوئے، اس لیے اقبال کی غیرت نے یہ نہیں گوارا کیا کہ کسی بدنام عورت کو اپنے گھر میں جگہ دیں۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد دوسری بیگم کی نیک چلنی کا ثبوت مل گیا، تب وہ ان سے دوبارہ نکاح کر کے خوشگوار زندگی گزارنے لگے۔[۱]

اقبال کی خود داری کا ایک اور واقعہ عبدالمجید سالک نے لکھا ہے:

"ایک بار لدھیانہ والے برادر نسبتی غلام محمد نے اقبال سے کہا کہ وہ ایک کوٹھی خرید لیں، روپیہ وہ ادا کر دیں گے۔ مگر اقبال نے یہ شرط رکھی کہ وہ روپیہ خود ہی قسط وار ادا کر دیں گے ۔۔۔۔۔ اقبال نے مرزا جلال الدین کو غلام محمد کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ دھنپت رائے کی کوٹھی خرید لیں۔ راستہ میں غلام محمد نے مرزا صاحب سے کہا کہ مکان کی رسید میری بہن کے نام لکھی جائے گی۔ یہ سن کر مرزا صاحب کو تشویش ہوئی، مگر جب یہ دونوں مالکِ کوٹھی کے یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کوٹھی فروخت ہو گئی۔ مرزا جلال الدین نے یہ سارا واقعہ اقبال صاحب سے بتایا۔ انھوں نے فرمایا "اچھا ہوا یہ سودا نہ ہوا، ورنہ مجھے اپنی بیوی کے مکان میں رہنا پڑتا۔"[۲]

اقبال کی خود داری کا ایک اور واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے:

ایک بار اقبال کو عطیہ بیگم نے جنجیرہ آنے کی دعوت دی۔ مگر اقبال نے لکھ دیا کہ وہ طویل سفر سے بہت گھبراتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کو حیدر آباد کسی کام سے جانے کا اتفاق ہوا۔ سفر حیدر آباد کے بعد وہ لاہور واپس آ گئے۔ اقبال

---

[۱] ذکر اقبال ۔ عبدالمجید سالک ۔ ص ۶۷ - ۷۰

[۲] " " " ص ۷۱ - ۷۲

کے اس سفر کی اطلاع عطیہ بیگم کو ہوئی اور انھوں نے ایک مبد آلود خط ان کو لکھا اور طعنہ دیا کہ آپ وہاں تلاش ملازمت کے لیے گئے تھے۔ اقبال نے ان کو جواب لکھا اور جنجیرہ میں غیر حاضری کے لیے معذرت چاہی" اس کے ساتھ ہی انھوں نے حیدرآباد کی ملازمت کے سلسلے میں لکھا "رہا حیدرآباد میں ملازمت کا سوال تو میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔[۱]

ڈاکٹر اقبال کی خودداری کا ایک اور واقعہ سُنیے :

"ڈاکٹر اقبال ... الور کی پرائیویٹ سکرٹیری شپ کا عہدہ مل رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ منشی طاہر الدین اور علی بخش کے ہمراہ الور گئے۔ دوسرے دن ایک مسلمان حجام نے جو اُن کی ڈاڑھی بنانے آیا تھا بتایا کہ ریاست الور کی ملازمت مناسب نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقبال کو مہاراجہ سے گفتگو کے بعد علم ہوا کہ ان کو چھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملے گی۔ حالات معلوم کر کے اقبال لاہور واپس آ گئے اور یہاں سے انکار کا خط مہاراجہ الور کو روانہ کر دیا۔"[۲]

ڈاکٹر اقبال کے یہ سارے واقعات ان کی خودداری پر روشنی ڈالتے ہیں اس کے علاوہ ان کی شاعری کا مطالعہ بھی ان کی خودداری کو ثابت کرتا ہے۔ مثلاً اقبال اتنے خوددار ہیں کہ وہ بجز خدا کے کسی امیر و وزیر کے در پر سر جھکانا پسند نہیں کرتے۔

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر   میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

اقبال کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ وہ تقاضے کو خودداری کے منافی سمجھتے ہیں۔

تھا ارنی گو کلیم، میں ارنی گو نہیں   اس کو تقاضا روا، مجھ پہ تقاضا حرام

اقبال کا مندرجہ ذیل شعر بھی خودداری کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے :

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری   خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

اقبال کی داستان منت کش تاب شنیدن نہیں ہے، کیوں کہ وہ خوددار واقع ہوئے ہیں، ان کی نظر بھی

---

[۱] ذکر اقبال عبدالمجید سالک ص ۷۴-۷۵

[۲] " " ص ۸۳-۸۴

ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی نہیں ہے۔

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

اقبال خاموش زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں، اس لیے وہ منت کشِ ہنگامہ نہیں ہیں۔

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت اور منت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

اقبال بے آبروئی کی زندگی گزارنا پسند نہیں کرتے، کیوں کہ وہ خوددار ہیں۔

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اقبال نے اپنی ذات سے الگ ہٹ کر کائنات کے افراد کے لیے بھی خودداری کی تلقین کی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:۔

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

اقبال نے اس شعر میں بتایا ہے کہ انسان کو رفو کا احسان مند نہ ہونا چاہیے۔ اقبال نفسِ غیر پر انحصار کو بھی خودداری کے منافی بتاتے ہیں۔

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

اقبال نے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی بنی نوعِ انسان کو خودداری کی تعلیم دی ہے:

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر
پہلے خوددار تو مانندِ سکندر ہو لے پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ خودداری کر

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

اقبال بعض اوقات بے نطق اشیاء کی زبانی انسان کو خودداری کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم شمع اور شاعر میں شمع شاعر سے کہتی ہے:

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بدامن ہو گئیں

آگے چل کر شمع شاعر سے کہتی ہے:

عین دریا میں حباب سانگوں پیمانہ کر	تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو

اسی طرح مندرجہ ذیل شعر میں شمع شاعر کو خودداری کا درس دیتی ہے:

مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو	وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا

اقبال کے یہاں ایک اور اسلوب ملتا ہے۔ وہ بعض وقت بے نطق چیز کو بھی مخاطب کرتے ہیں اور اس تخاطب کے ذریعہ انسان کو خودداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنی نظم "پھول" میں پھول کو مخاطب کرتے ہیں:

نہ رہ منت کشِ شبنم، نگوں جام و سبو کر دے	تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے	نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو

اقبال کے ان اشعار سے ان کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال کی خودداری میں بڑی چمک، دمک اور شگفتگی و زندگی ہے۔ یہ خودداری ان نرگسی شعراء کے میکدے میں تھا دیتی ہے۔

فانی

(۱۸۷۹ء — ۱۹۴۱ء)

فانی کی شاعری میں بھی خودداری کے رنگین نقوش نظر آتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ فانی کا تعلق امیر و کبیر خاندان سے تھا۔ وہ نسلی اعتبار سے افغانی تھے۔ فانی کے مورث اعلیٰ اصالت خاں افغانستان سے ہندوستان آئے تھے اور دلّی میں مقیم ہوئے تھے۔ شاہی دربار نے ان کی کافی قدر و منزلت کی تھی۔ فانی کے پردادا نواب بشارت علی خاں صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ ان کی جائداد میں تقریباً دو سو مواضعات شامل تھے۔ بشارت علی خاں نہایت شان و شوکت کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ ہر گیارھویں شریف کی تقریب میں سوا لاکھ روپیہ صرف کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں اس خاندان کی جائداد تباہ ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب جامِ عیش فانی کے ہاتھوں تک پہنچا تو اس میں مئے رنگین کے صرف چند قطرے رہ گئے تھے۔ اب اس جائداد

کی آمدنی صرف تیرہ چودہ سو روپے ماہوار تھی، مگر یہ جائداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ چوں کہ فانی نے امیرانہ ماحول میں آنکھ کھولی، اس لیے ان کی ذات میں خودداری پیوست ہوگئی۔

دراصل فانی کی ذات میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی زندگی کے مختلف واقعات ان کی خودداری پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مولوی طفیل احمد جج کا بیان ہے کہ میرا تبادلہ بریلی سے اٹاوہ ہوگیا۔ اس زمانے میں اٹاوہ ہی میں فانی وکالت کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب میں فانی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکوں گا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ میں تو اٹاوہ اسٹیشن پر ریل سے اتر رہا ہوں اور فانی اٹاوہ اسٹیشن پر ریل پر سوار ہو رہے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فانی قدر خوددار انسان تھے۔

فانی کی خودداری کا ایک اور واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ فانی ایک بار کلکتہ پہنچے۔ جب اہلِ کلکتہ کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان کے اعزاز میں زیرِ صدارت نصیرالملک سفیرِ ایران ایک مشاعرہ کا اعلان کر دیا۔ جس شام کو مشاعرہ ہونے والا تھا، فانی سب سامان کلکتہ میں چھوڑ کر بدایوں واپس چلے آئے۔

جس طرح فانی کی زندگی میں خودداری کی تابناکی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری سے بھی خودداری کی شعاعیں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

کسی کی پرسشِ پنہاں سے کیوں ہو داد طلب   وہ حال جو کبھی منت کشِ زباں نہ ہوا

فانی کی خودداری کا یہ حال ہے کہ وہ محبوب سے حال کہنے کے لیے زبان کا احسان لینا نہیں چاہتے۔ پھر اس کا سوال ہی کیا ہے کہ وہ پرسشِ پنہاں کی توقع کریں۔ فانی نے ایک اور خودداری کا شعر کہا ہے:

آ کر پلٹ نہ خالی لے مرگ جان لے جا   فانی کے سر پہ تیرا احسان رہ نہ جائے

فانی کہتے ہیں کہ اے موت تو میری جان لے جا، تو خالی ہاتھ نہ پلٹ۔ ورنہ تو کہے گی کہ میں نے فانی پر احسان کیا۔ فانی ایک جگہ اور موت سے مخاطب ہوئے ہیں:

اے اجل کام نہ اپنا کسی عنواں نکلا   دم تو نکلا مگر آزردہ احساں نکلا

فانی کو اس بات کی شرمندگی ہے کہ ان کا دم تو نکلا اور اس طرح ان کو مشکلوں سے نجات مل گئی۔ مگر یہ نجات موت کی مدد سے ملی اور وہ موت کا احسان نہیں لینا چاہتے تھے۔

دراصل فانی کی خودداری قابلِ توجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی خودداری میں شیرینی کے بجائے تلخی ہے اور یہ ان کے مزاج کی دین ہے۔ فانی خودداری کے سلسلے میں بھی موت کا ذکر کرتے ہیں اور موت کے احسان کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ بہر حال ان کی خودداری کی نوعیت کچھ بھی ہو، ہم ان کو ایک نرگسی شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

حسرت

(۱۸۷۵ء — ۱۹۵۱ء)

حسرت کی شاعری میں بھی خودداری کی ایک حسین آرسی جلوہ گر ہے جس میں ان کی شکل نظر آتی ہے۔ حسرت نہایت خوددار، صاف گو اور حق پرست انسان تھے۔ ان کے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ان کی خودداری کو تسلیم کیا ہے۔ چناں چہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے اپنے "پیش گفت" میں لکھا ہے کہ:

> "مولانا حسرت موہانی اپنے ذاتی کام سے کبھی کسی امیر یا حاکم کے پاس نہیں گئے، مگر ضرورت مند دوں کے لیے ارباب ثروت سے سفارش کرنے میں انھیں تامل نہ ہوتا تھا۔ ارباب غرض انھیں اپنے کاموں کے لیے وزرا یا حکام کے پاس لے جاتے تو وہ بے تکلف چلے جاتے"۔[۱]

مولانا جمال میاں کے اس بیان سے حسرت کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔ آگے چل کر جمال میاں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ان کی زندگی درویشانہ بلکہ قلندرانہ تھی اور مزاج میں حد درجہ استغنا

---

[۱] کلیات حسرت موہانی 'پیش گفت' جمال میاں فرنگی محلی۔ ص ۴۹

تھا۔ انھوں نے کبھی لیڈر بننے کی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی بڑے سے بڑے لیڈر سے مرعوب ہوئے۔

دنیا داری کے لحاظ سے وہ بڑی مختصر تمنائیں رکھنے والے انسان تھے۔ اس لیے ان پر کبھی مایوسی کی کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی۔" لہ

چوں کہ حسرت کی طبیعت میں استغنا تھا اس لیے وہ اپنی خودداری کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

تقسیم ہند کے بعد حسرت ہندوستان ہی میں رہے مگر انھوں نے کبھی پاکستان کی مذمت نہیں کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پاکستان کے مدّاح اور ہندوستان کے دشمن تھے بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں بیٹھ کر پاکستان کی مذمت کرنے سے ہندوستانی حکومت کو یہ بدگمانی ہوگی کہ میں اس کی خوشامد کرتا ہوں۔ مولانا حسرت کا یہ نظریہ ان کی خودداری پر روشنی ڈالتا ہے۔

حسرت موہانی کی زندگی ہی کی طرح ان کی شاعری بھی تابناک ہے۔ ان کی شاعری کی محراب میں بھی خودداری کی شمع فروزاں ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں حسرت نے واضح طور پر اپنی خودداری کا اعلان کیا ہے:

رہ گئی شرم ہے کسی حسرت
مجھ پہ احسانِ اہلِ زر نہ ہوا

حسرت نے مندرجہ ذیل شعر میں خود کو غیور کہا ہے:

کچھ محبت بھی عجب شے ہے کہ حسرت سا غیور
اور اسے آپ نے خود کردۂ دشنام کیا

حسرت خضر و مسیحا کے احسان کو معیوب سمجھتے ہیں:

گم کردہ راہِ عشق فنا کیوں نہ ہو گیا
احسان جو اس پہ خضر و مسیحا کے رہ گئے

حسرت شرمندۂ درماں بھی ہونا نہیں چاہتے ہیں:

وصل سے شوق کی شورش نہ ہوئی کم حسرت
ہے یہ وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہوا

لہ کلیات حسرت موہانی۔ پیش گفت جمال میاں فرنگی۔ ص ۴۹

غرضیکہ ہم حسرت کو خود دار اور غیور شعرا میں شمار کر سکتے ہیں اور ان کو نرگسی شعرا کے زمرہ میں جگہ دے سکتے ہیں۔

یگانہ چنگیزی

(۱۸۸۴ء — ۱۹۵۶ء)

یگانہ چنگیزی کو خاندانی مرتبت حاصل ہے۔ ان کے جد امجد ایران سے ہندوستان آئے اور سلطنت مغلیہ میں ایک اعلیٰ فوجی عہدہ حاصل کر لیا۔ ان کو پرگنہ حوالی عظیم آباد میں جاگیریں عطا ہوئیں اور وہ مستقل طور سے وہیں آباد ہو گئے۔ اس کا امکان ہے کہ یگانہ کی خودداری ان کی خاندانی برتری کی بنا پر ظہور پذیر ہوئی ہو۔

یگانہ کی خودداری کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کچھ خود دار شعرا کا خاص طور سے مطالعہ کیا اور ان کے مزاج کی خصوصیات کو اپنی شخصیت میں جذب کر لیا۔ انھوں نے میر کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر کی خودداری، بے نیازی یہاں تک کہ ان کی بد دماغی ان کے مزاج میں داخل ہو گئی۔ یگانہ نے آتش کا مطالعہ بھی عمیق نظروں سے کیا۔ آتش کے یہاں جو بانکپن ملتا ہے۔ وہ یگانہ کے مزاج کے مطابق تھا، اس لیے انھوں نے آتش سے بانکپن حاصل کیا۔

یگانہ نے میر انیس کے کلام کا مطالعہ بھی دل چسپی کے ساتھ کیا۔ میر انیس درباری شاعر نہیں تھے، اس لیے ان کے مزاج میں بھی بے نیازی تھی۔ میر انیس کے مطالعہ کا اثر بھی یگانہ پر پڑا۔ بہرحال یگانہ کے رجحان کی تشکیل میں میر، آتش اور انیس کا مزاج شامل ہے۔ یگانہ نے ایک شعر میں ان تینوں شعرا کا ذکر کیا ہے:

اثر جیسا کیا چاہو سخن میں طرز دلکش سے   تو انداز بیاں سیکھو انیس و میر آتش سے

یگانہ چنگیزی نے اپنی ساری عمر نہایت خودداری کے ساتھ گزاری۔ وہ امیروں اور رئیسوں سے دب کر نہیں ملتے تھے۔ یہاں تک کہ دوران ملازمت میں انھوں نے کسی اپنے افسر کے سامنے بھی سر نہ جھکایا۔ بلکہ جائز معاملات ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ

اپنی ملازمت میں زیادہ ترقی نہیں کر سکے۔ وہ حیدرآباد میں سب رجسٹرار کے عہدے پر ملازم تھے اور اسی عہدے سے وہ سبکدوش بھی ہوئے۔

"جب یگانہ صاحب کی سبکدوشی کا وقت قریب آیا تو اُن سے پرنس معظم جاہ بہادر نے کہا کہ وہ وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی با تنخواہ رخصت لے کر ان کے پاس آ جائیں، مگر مرزا صاحب کو درباداری سے نفرت تھی۔ اس لیے انھوں نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا"۔ ؎۱

یگانہ چنگیزی کی خودداری ان کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ظاہر ہوتی ہے:

"اہلِ لکھنؤ کو عموماً اور میاں عزیز کو خصوصاً جو قلبی عداوت اس خاک عظیم آباد سے ہے اور قلمی معرکہ آرائی کی تاب نہ لا کر خاکسار کی آبرو ریزی کی جو فکریں کی گئیں اور ہوتی رہیں گی، ان پر اہلِ لکھنؤ کو جہاں تک داد دی جائے بجا ہے۔ الحمد للہ کہ میں اپنی جگہ پر قایم ہوں۔ لکھنؤ کی یزیدی فوج کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا، اپنے حسینی مسلک سے پیچھے نہ ہٹنا اور اپنی آزادی اور خودداری کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں بظاہر پامال ہو جانا، ایک تنِ تنہا کے لیے ہزاروں فتح سے بڑھ کر ہے"۔ ؎۲

چوں کہ یگانہ چنگیزی از حد خوددار تھے، اس لیے ان کو غالب کی بے غیرتی پسند نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غالب کے کردار پر سختی سے حملہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"افسوس ہے غالب نے چار دن بھی بہادر شاہ کے نمک کا پاس نہ کیا۔ تخت اُلٹتے ہی انگریزوں کے وفادار و نمک خوار بن گئے"۔ ؎۳

اسی خط میں یگانہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

؎۱ نقوش شخصیات نمبر۔ مضمون، سید اعظم حسین اعظم۔ ص ۸۶۹

؎۲ شہرت کاذبہ۔ مرزا یاس۔ ص ۳۲

؎۳ تصویر کا دوسرا رخ۔ مرتبہ تحسین اعجازی۔ مکتوب یگانہ بنام پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۶

در غالب میں تو اوسط درجے کی خودداری اور میرزائیت بھی نہ تھی جو اس زمانے کے عام شرفار کا چلن تھا۔ دلی کا تخت الٹ گیا۔ بہادر شاہ قید ہو کر رنگون سدھارے" اور غالب کو اپنے حلوے مانڈے، خلعت و پنشن جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کی ہوس دامنگیر رہی۔ بڑھاپے میں لاٹ صاحب کے دربار میں شریک ہونے کی ہوس دل میں رہ گئی"۔ [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یگانہ چنگیزی بے حد خوددار انسان تھے۔ انھوں نے ساری زندگی غیرت و حمیت کے ساتھ بسر کی۔ ان کی زندگی کا عکس واضح طور پر ہم کو ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

یگانہ چنگیزی کی خودداری کے تیور مندرجہ ذیل شعر میں دیکھیے۔ وہ بھیک مانگنا خودداری کے منافی سمجھتے ہیں۔

خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو بن پڑے تو جھپٹ لے بھیک نہ مانگ

یاس یگانہ اس سے ملنا پسند نہیں کرتے جو اُن سے جھک کر نہ ملے

انساں کو ہے حفظ مراتب کا بھی کچھ دھیان کیوں اس سے ملے یاس جو جھک کر نہیں ملتا

اسی قسم کی خودداری کا اظہار یگانہ نے اس شعر میں بھی کیا ہے:

وہ ہم سے نہیں ملتے، ہم اُن سے نہیں ملتے اک نازِ دل آویز، اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

یاس دنیاوی خداؤں سے عاجز آ گئے ہیں:

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

اگر کوئی گاہک نہیں ہے تو یاس آئینۂ دل کو بھی پھینک دینا چاہتے ہیں:

پھینک دو آئینۂ دل کو جو گاہک اُٹھ گئے اب نہیں بازار میں اس کی خریداری نہیں

یگانہ دوسروں کا احسان اُٹھانے سے کس قدر گریزاں ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

احسان کس کا مانیے کس کا نہ مانیے پردے میں ناخدا کے کوئی دوسرا نہ ہو

---

[1] تصویر کا دوسرا رخ۔ مرتبہ تحسین اعجازی۔ مکتوب یگانہ بنام پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۲۳

یگانہ جنسِ وفا کی کساد بازاری کو بھی برداشت نہیں کر سکتے:

جنسِ وفا نہ تھی کوئی مفلس کا مال تھا   دل ہٹ گیا نگاہِ خریدار دیکھ کر

یگانہ اتنے خوددار ہیں کہ وہ سرِ بازار رسوا ہونا نہیں چاہتے:

زندانِ مصیبت سے کوئی نکلے تو کیونکر   رسوا سرِ بازار ہوا بھی نہیں جاتا

یگانہ اس بات میں اپنی ذلت محسوس کرتے ہیں کہ وہ بندگی کا ثبوت دیں۔ اس سے بہتر وہ سرے سے انکار ہی کو سمجھتے ہیں:

بندگی کا ثبوت دوں کیونکر   اس سے بہتر ہے کیجیے انکار

یگانہ کی دعا جب قبول نہیں ہوئی تو وہ اپنی خودداری کی بنا پر ترکِ دعا پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی   لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

اسی مایوسی نے یگانہ کی خودداری کو جنم دیا۔ چنانچہ وہ اب مناجاتوں سے بھی ہاتھ اٹھا رہے ہیں:

بے نیازی کی کوئی حد بھی ہے آخر کب تک   ہاتھ اٹھاؤ بھی کہیں پاس مناجاتوں سے

یگانہ کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ ڈوبتے وقت بھی کسی کو پکار کر اس کا احسان لینا نہیں چاہتے۔

دیکھئے رہ گئے پاس آپ نے اچھا نہ کیا   ڈوبتے وقت کسی کو تو پکارا ہوتا

یگانہ اس بات سے خوش ہیں کہ موت نے ان کو احسانِ بے سبب سے گراں بار دیکھ کر آزاد کر دیا۔

آخر اجل نے رحم کر آزاد کر دیا   احسانِ بے سبب سے گراں بار دیکھ کر

لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو ایک بات کا افسوس اب بھی ہے کہ انھوں نے زندگی بھر کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ مگر ان کی موت کے بعد یاروں نے ان کی لاش اٹھائی۔ ان پر احباب کا بہر حال یہ احسان رہ ہی گیا۔ جو اُن کے مزاج کے خلاف تھا:

زندگی بھر تک تو شرمندہ نہ تھے یاروں سے ہم   لاش اٹھانے کا مگر آخر اک احسان رہ گیا

یہ حقیقت ہے کہ یگانہ کا جیسا خوددار شاعر اردو شاعری میں مشکل سے ملے گا۔ یگانہ کی خودداری غالب سے مختلف ہے۔ غالب کو اپنے علوئے خاندان اور امیرانہ شان پر ناز تھا، اس لیے وہ خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، مگر یگانہ میں میر جیسی خودداری ہے۔ میر کی طرح یگانہ کو بھی زمانے نے زہر کے گھونٹ پلائے۔ انھوں نے بھی قدم قدم پر ٹھوکر کھائی۔ ان کو دشمنوں نے بے حد تنگ کیا جس سے ان کا جینا دشوار ہو گیا۔ اسی لیے یگانہ نے اہلِ دنیا کو ٹھکرا دیا۔ یگانہ کی خودداری ان کی اسی ٹھوکر سے پیدا ہوئی ہے۔

جگر مرادآبادی

(۱۸۹۰ء — ۱۹۶۰ء)

جگر کے کلام میں خودداری کے موتی ہی نہیں ملتے بلکہ ان کی شاعری کی وادی میں غیرت و حمیت کے لعل و گہر اور یاقوت و عقیق کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ جگر کی خودداری کو سمجھنے کے لیے ہم کو ان کی زندگی اور شاعری دونوں کا مطالعہ غور اور احتیاط سے ساتھ کرنا ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو جگر کے خاندان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جگر کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع صاحب دہلی کے باشندے تھے اور فرخ سیر بادشاہ کو حدیث کا درس دیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد دہلی کے اس خاندان کے دو حصے ہو گئے۔ ایک حصہ اعظم پور باشتہ میں آباد ہو گیا اور دوسرے حصے نے مرادآباد میں سکونت اختیار کی ہوں کہ جگر کے مورثِ اعلیٰ فرخ سیر بادشاہ کے اتالیق تھے، اس لیے اس کا امکان ہے کہ جگر کے مزاج میں بالواسطہ خودداری کے جراثیم داخل ہو گئے ہوں۔

جگر کے پردادا حافظ نور محمد اور دادا حافظ امجد علی بھی شاعر تھے۔ اس کے علاوہ جگر کے والد مولوی علی نظر نظر اور اُن کے چچا علی ظفر بھی شعر کہتے تھے۔ یہ ساری باتیں بھی جگر میں خودداری پیدا کر سکتی ہیں۔

جگر کی خودداری کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کو خدا نے لحنِ داؤدی عطا کیا تھا۔ ان کی خوش گلوئی پر سلمان ساؤجی کا یہ شعر منطبق ہوسکتا ہے ؎

از پئے خسرو گل بلبلِ شیریں گفتار
نغمۂ بار بد و صوت نگیسا آورد

ایک تو جگر کی غزل میں سلاست، روانی، رنگینی اور شگفتگی ہوتی تھی۔ پھر وہ نہایت خوش گلوئی اور سرمستی کے ساتھ اپنی غزل پڑھتے تھے اس لیے مشاعرہ کو لوٹ لیتے تھے۔ دراصل وہ مشاعروں کے بادشاہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوسکتی ہے۔ جگر کی خودداری اس کامیابی کی بھی دین ہے۔

جگر کی خودداری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کو دوسرے عشق میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جب وہ آگرہ میں مقیم تھے تو ان کو وحیدن بیگم سے عشق ہوگیا، جو عام طور سے پنجابی کہلاتی تھیں۔ ابتدا میں وحیدن بیگم ان کی طرف نظرِ التفات نہیں کرتی تھیں۔ اسی غم میں جگر نے "ہلالِ عید" نظم کہی۔ کیوں کہ جگر کو عید کی آمد سے کچھ خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وحیدن کی چشمِ عنایت جگر پر ہوئی۔ اس وقت جگر نے یہ غزل کہی :

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لیے　　ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لیے

اس کے بعد وحیدن بیگم نے جگر سے تقریباً ۱۹۱۰ء میں شادی کرلی۔

جگر کی زندگی کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بارہا خودداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی سرشت میں خودداری کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے تھے۔ وہ بچپن ہی سے نہایت خوددار اور غیور واقع ہوئے تھے۔ جگر کی خودداری کے ثبوت میں ان کے ایک سانحۂ زندگی کو پیش کیا جاسکتا ہے :

" جگر کو تقریباً ۱۹۰۵ء میں ان کے چچا علی ظفر کی وساطت سے نجیب آباد میونسپلٹی میں محافظ دفتر کی جگہ مل گئی تھی۔ یہیں ان کے چچا کے ایک دوست تحصیلدار صاحب بھی رہتے تھے، جنھوں نے ایک طوائف سے شادی کرلی تھی۔ اس گھر میں جگر کی بھی آمد و رفت

تھی۔ چناں چہ جگرؔ کو تحصیلدار صاحب کی بیوی سے محبت ہوگئی۔ انھوں نے ایک روز ایک خط کے ذریعہ ان بیگم صاحب سے اظہار عشق کیا۔ غالباً اس طوائف کو جگرؔ کی یہ جرأت ناگوار گزری۔ اس نے وہ خط اپنے شوہر کے حوالے کر دیا، اور تحصیلدار صاحب نے وہ خط جگرؔ کے چچا علی ظفر کے پاس بھیج دیا۔ علی ظفر نے جگرؔ کو خط لکھا کہ وہ نجیب آباد خود آرہے ہیں۔ جگرؔ صاحب اس خبر سے اس قدر گھبرائے کہ انھوں نے بھنگ کھالی۔ لوگوں نے بہت تگ و دو کی اور کسی طرح جگرؔ کی جان بچائی۔ جگرؔ نے ندامت کی وجہ سے نجیب آباد ترک کر دیا، اور وہ آگرہ پہنچ گئے۔ انھوں نے وہاں عینک کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس کے بعد شرمندگی کی بنا پر مراد آباد نہیں گئے۔ تقریباً دس بارہ برس کے بعد وحیدن بیگم کے ساتھ مراد آباد کی زیارت کی۔[1] اس واقعہ سے جگرؔ کی خودداری پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔

جگرؔ کی خودداری کا ایک اور واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے:

جگرؔ نے وحیدن بیگم سے شادی کے بعد مراد آباد میں سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ کے بعد مراد آباد ہی میں جگرؔ اور وحیدن بیگم کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اس کشیدگی پر جگرؔ کے حقیقی چھوٹے بھائی علی مظفر صاحب نے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا قول ہے کہ وحیدن بیگم کے ایک رشتہ کے بھائی محمد عاقل تھے، جو جگرؔ کے گھر پر آیا جایا کرتے تھے۔ وحیدن بیگم کی توجہ محمد عاقل کی طرف ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ایک دن وحیدن بیگم سے علی مظفر کی موجودگی میں ناشائستہ مذاق کر بیٹھے۔ علی مظفر صاحب کو یہ مذاق ناگوار گزرا اور انھوں نے محمد عاقل سے کہا کہ اگر آپ کو گھر میں آنا ہو تو قاعدے سے آیا کیجیے، ورنہ بھائی صاحب کی غیر موجودگی میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

وحیدن بیگم اور محمد عاقل کے تعلقات کا علم جگرؔ کو بھی ہوگیا۔ ایک روز جگرؔ نے محمد عاقل سے کہا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ جگرؔ سفر کے لیے تیار ہوگئے۔ محمد عاقل ان کو اسٹیشن تک پہنچا گئے اور پھر جگرؔ کے گھر

---

[1] جگرؔ مراد آبادی۔ حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر محمد اسلام۔ ص ۶۶

واپس آ گئے۔ ادھر جگر صرف ایک اسٹیشن تک گئے اور پھر دوسرے اسٹیشن پر اتر پڑے۔ اور سیدھے اپنے گھر پلٹ آئے۔ یہاں اپنی عدم موجودگی میں محمد عاقل کو وحیدن بیگم کے ساتھ عالم اختلاط میں پایا۔ جگر صاحب کے دل پر ایک بجلی گری اور وہ گھر سے نکل گئے جگر نے اس طرح وحیدن بیگم سے قطع تعلق کر لیا۔ دوسری طرف وحیدن بیگم نے چھ ماہ تک جگر کا انتظار کیا۔ جب وہ واپس نہیں آئے تو محمد عاقل سے شادی کر لی اور پھر اجمیر چلی گئیں جہاں ان کا کچھ عرصے بعد انتقال ہو گیا۔ جگر صاحب جب مراد آباد سے نکلے تو اناؤ، کانپور، اعظم گڑھ گونڈہ اور مین پوری وغیرہ میں مارے مارے پھرتے رہے۔ اس واقعہ سے بھی جگر صاحب کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔

جگر صاحب کی خودداری کے ایک واقعہ کو ڈاکٹر محمد اسلام نے پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"وہ خوددار ایسے تھے کہ انھوں نے ۱۹۳۶ء کے زمانے میں جب کہ وہ خود پیسوں کے ضرورت مند تھے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی۔ اراکین مشاعرہ نے ان کو اخراجات نہ دیے تو انھوں نے ۲۹ جنوری ۱۹۳۶ء کو نواب سید علی حسن کو لکھا، اگر روش صاحب، ساغر صاحب اور سیماب صاحب کو طلب کر کے ان کے تمام اخراجات ادا کیے گئے تو آخر مجھے کیوں نقصان پہنچانا گوارا کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرات موصوف کی تمنا ہو کہ میں براہ راست ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہوں لیکن میں انشاء اللہ کبھی بھی ایسا نہ کر سکوں گا، خواہ کتنی ہی تکلیف و اذیت پہنچے"۔ [۵]

ایک بار جب جگر بیمار ہوئے تو ان کی مدد کے پیش نظر بمبئی میں دی شنکر نے جشن جگر منانے کا انتظام کیا۔ جب جگر صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ یہ جشن ہرگز نہیں ہوگا اور کہا کہ اس جشن سے میری روح کو تکلیف پہنچے گی۔ مگر کچھ احباب نے ان کو راضی کر لیا۔

---

[۵] جگر مراد آبادی۔ حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر محمد اسلام۔ ص ۱۴۹

اس جشن سے دس ہزار کی آمدنی ہوئی، جس کو جگر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ لیکن اس رقم کو جگر صاحب نے بڑی مشکل سے قبول فرمایا۔ جشن کے بعد انھوں نے دی بمبئی کو شکریہ کا خط ان الفاظ میں لکھا:

"خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جہاں کہیں سچی محبت اور اخلاص، شرافت نفس اور انسانیت محسوس کر لیتا ہوں میں اس کا ہو جاتا ہوں ...... خوددارانہ زندگی بسر کی، اور میں اپنی روش پر نازاں بھی ہوں" [1]

جگر کی خودداری کا ایک واقعہ صدیق حسن صاحب نے لکھا ہے۔ ان کا قول ہے کہ آتش گل کی طباعت کے بعد انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اس کتاب کی پچاس جلدوں پر جگر صاحب سے دستخط کرالیں۔ اس طرح اس بات کا امکان ہے کہ وہ جلدیں زیادہ قیمت پر فروخت ہو سکیں، اسی خیال کے تحت انھوں نے جگر صاحب سے درخواست کی کہ وہ پچاس کتب پر اپنے دستخط بنا دیں۔ مگر جگر صاحب کی خودداری نے اس بات کو گوارا نہیں کیا اور انھوں نے صدیق حسن صاحب سے کہا "میں اپنے دستخط بیچوں ؟"

ایک بار مجروح سلطان پوری نے جگر کی مدد کرنا چاہی اور حیدرآباد کے چھوٹے شہزادے معظم جاہ بہادر کے دیوان پر اصلاح کے لیے جگر صاحب کی خدمات حاصل کر لیں اور اس کے معاوضے میں پانچ ہزار روپے طے کر لیے۔ اس کام کے لیے مجروح اور جگر دونوں نظام پیلس میں مقیم ہو گئے۔ اتنے میں گونڈہ سے جگر کی اہلیہ نسیم صاحبہ کی علالت کی خبر ملی اور جگر نے معظم جاہ بہادر سے گونڈہ جانے کی اجازت چاہی۔ شہزادے صاحب جگر کی خاطر مدارات کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اجازت نہ دی۔ جگر صاحب کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ اور انھوں نے مجروح سے

---

[1] جگر مرادآبادی۔ حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر محمد اسلام۔ ص ۱۵۰

کہا کہ:

"میاں دراصل یہ غلامی ان روپیوں کی ہے۔ مجھے نہیں چاہئیں یہ روپے۔ لے جاؤ اور اُن کو واپس کر دو۔ اس کے بعد جگر گونڈہ چلے آئے" لہ

تبسم نظامی نے بھی جگر کی خودداری کا ایک قصہ بیان کیا ہے:

۱۹۳۲ء میں جگر حیدرآباد سے وارنگل گئے۔ وہاں وارنگل کالج کی یونین کی طرف سے ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ جب مشاعرہ ختم ہوگیا تو وہاں کے طلبہ نے جگر صاحب کو ایک کیسہ زر پیش کیا۔ مگر جگر صاحب نے یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ میں شاعر ہوں گویا نہیں ہوں۔ لیکن طلبہ نے کہا کہ ہماری یونین کا یہ دستور ہے کہ ہم بڑے شعراء کو کیسہ زر پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود جگر صاحب نے وہ روپیہ قبول نہیں کیا۔

جگر کی خودداری کی ایک اور مثال پیش کی جا سکتی ہے:۔

مسز سروجنی نائیڈو جگر کی بڑی مداح تھیں اور ان کو ہندوستان کا واحد شاعر تسلیم کرتی تھیں، جگر بھی ان کا احترام کرتے تھے، اور ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، مگر جب وہ اترپردیش کی گورنر ہوگئیں تو جگر نے آمد و رفت بند کر دی۔ مسز سروجنی نائیڈو نے بار بار ان کو خلوص سے بلایا مگر انھوں نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی صدارت میں جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی جگر شرکت نہیں کرتے تھے۔

جس طرح جگر کی زندگی کا مطالعہ ان کی خودداری پر روشنی ڈالتا ہے اسی طرح جگر کی شاعری میں بھی ان کی خودداری کے جلوے نظر آتے ہیں۔ مثلاً جگر فرماتے ہیں:۔

دکھاؤں عشق کی خودداریاں جگر میں بھی — جو ایک بات پہ قایم غرور و ناز ہے

لہ جگر مرادآبادی۔ حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر محمد اسلام۔ ص ۱۵۳

اس شعر میں جگر نے واضح طور پر کہہ دیا کہ میں عشق کی خودداریاں دکھا سکتا ہوں بشرطیکہ محبوب کا غرور و ناز ایک بات پر قائم رہے۔ جگر نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی خودداری کا اظہار کیا ہے:

دل سنگِ ملامت کا ہرچند نشانا ہے　　　دل پھر بھی مرا دل ہے دل ہے تو زمانا ہے

"دل پھر بھی مرا دل ہے" ٹکڑے میں شاعر کی بے پناہ خودداری کا جذبہ کروٹیں لے رہا ہے۔

جگر نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی بھرپور طریقے پر خودداری کا اظہار کیا ہے :۔

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے　　　ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانا ہے

جگر کو اپنی خودداری پر بڑا ناز ہے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

خودداری و محرومی، محرومی و خودداری　　　اب دل کو خدا رکھے اب دل کا زمانا ہے

جگر جیسا خوددار شاعر محبوب کی چشم پوشی کو کیوں کر برداشت کر سکتا ہے:

ہم سے نظر پھیر لی اس شوخ نے　　　ہم بھی ہیں انسان خفا ہو گئے

مندرجہ ذیل شعر میں جگر کی خودداری ایک نازک منزل میں داخل ہو گئی ہے:

دیا ہے عشق نے وہ مرتبہ بحمد اللہ　　　کہ آنکھ تک نہ اٹھاؤں اگر حیا تو آئے

جب محبوب نے طرزِ التفات بدل دی تو جگر نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی۔

ہم نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی　　　جب سے وہ طرزِ التفات گئی

جگر نے نہایت تیور کے ساتھ محبوب کو ٹھکرا دیا ہے:

مجھے بھی ہے احساس اپنی خودی کا　　　اگر اُن کو میری ضرورت نہیں ہے

جگر انسانیت کی پہلی شرط خودداری کو سمجھتے ہیں۔

محبت میں کہاں ممکن ذلیل و خوار ہو جانا　　　کہ پہلی شرط ہے انسان کا خوددار ہو جانا

جگر کی غیرت مندی ایک اور شعر میں ملاحظہ فرمایئے:

ہیں وہ غیرت مند بلبل تم دکھایا پھر نہ منہ　　　لوٹ کر آ آ کے ڈھونڈا کی قفس سے تا قفس

جگر اتنے خوددار ہیں کہ وہ اپنے انا کی خاطر جان دینے کو بھی تیار ہیں:

اب اس میں جان مری جائے یا رہے صیاد　　بہار میں تو نہ چھوڑوں گا آشیانے کو

جگرؔ نے خودداری کا ایک نہایت نازک شعر کہا ہے:

وہ حالِ دل لب خاموش سے بھی سنتے ہیں　　یہ جانتا تو نہ شرمندۂ فغاں ہوتا

غرضیکہ جگرؔ کی زندگی اور شاعری میں بڑی حد تک ہم آہنگی ملتی ہے۔ جگرؔ نے خودداری کے جو اشعار کہے ہیں وہ رسمی نہیں ہیں بلکہ حقیقی ہیں اور ان میں ان کی ذات کا عکس جھلکتا ہے۔ خودداری کے نقطۂ نظر سے جگرؔ ایک لطف نرگسیت کے مالک ہیں۔

شاد عارفی

(۱۹۰۰ء — ۱۹۶۴ء)

شادؔ عارفی کی شاعری میں خودداری کا کوندا لپکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے کچھ خاص اسباب ہیں۔ شادؔ کا تعلق اعلیٰ خاندان سے رہا ہے۔ ان کے ددھیال کا تعلق یاغستان کے رزڑ اور ڈوڈال قبائل سے ہے۔ ان کا ننھیال رام پوری ہے۔ مگر شادؔ عارفی کے والد اور والدہ خالص افغانی تھے اور وہ بھی رزڑ خاندان سے متعلق تھے۔ غرضیکہ شادؔ عارفی ایک کھرے پٹھان تھے، اس لیے ان کی خودداری میں کھرا پن نظر آتا ہے۔

شادؔ عارفی کے نانا مولوی سید ولی حسن کا ذکر "تذکرہ کاملانِ رام پور" میں موجود ہے۔ نواب ضیاء الدین خاں والیٔ لوہارو کے عربی معلم تھے۔ انھیں کے ساتھ شادؔ عارفی کے والد عارف اللہ خاں بھی لوہارو چلے گئے تھے، جہاں ان کو تھانیداری کا عہدہ مل گیا تھا۔ ان کے نانا اور والد ختم ملازمت کے بعد پنشن لے کر رام پور آ گئے۔ چوں کہ شادؔ عارفی نے تحکمانہ ماحول اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس لیے ان کی رگوں میں شان، عظمت اور خودداری پیوست ہو گئی۔

شادؔ عارفی کی تعلیم بھی اچھی خاصی ہوئی تھی۔ وہ انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کر چکے تھے مگر عربی و فارسی پر ان کو عبور حاصل تھا۔ ان کو سبعہ معلقہ کا ایک ایک شعر مع معنی و مطلب یاد تھا۔ ان شعرا میں ان کو لبید کا کلام زیادہ پسند تھا کیونکہ اس شاعر کے یہاں خودداری کی جھلک نظر آتی ہے

لبید کے مطالعہ نے شاد عارفی کو بھی خوددار بنا دیا۔ شاد عارفی کی خودداری کے بارے میں طاہرہ اختر لکھتی ہیں :-

"لڈن ماموں انتہائی خوددار، بہت چڑچڑے اور ہٹی قسم کے آدمی ہیں۔ "جو کی روٹی کھا کر آزاد رہ" ان کی زندگی کا اصول ہے، خوشامد کرنا نہیں جانتے صاف دل اور صاف گو ہیں۔ لگی لپٹی کے قایل نہیں ...... کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ رام پور کے اکثر رئیسوں نے ان کی امداد کرنا چاہی مگر لڈن ماموں نے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر رئیسوں سے روپیہ لوں گا تو ان کے خلاف پھر نظمیں کیسے لکھوں گا۔ میری شاعری کا مقصد فوت ہو جائے گا" [۱]

شاد عارفی ایک خوددار انسان اور خوددار شاعر تھے۔ ان کو غم دوراں نے خودداری کا ساغر دیا اور زہر کے گھونٹ پلائے۔ یگانہ چنگیزی کی طرح انھوں نے بھی تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر زندگی گزاری۔ ان کی شخصیت پر پروفیسر آل احمد سرور یوں روشنی ڈالتے ہیں :

"شاد عارفی بڑے البیلے شاعر تھے۔ نہایت عزت مند، خوددار" [۲]

شاد عارفی نے خود ہی "سفینہ چاہیے" میں اپنی خودداری پر روشنی ڈالی ہے:

"ابتدا میں، میں نے رنگین نظمیں، غزلیں بھی کہی ہیں۔ جو میرے دو عشقوں کی یادگار ہیں۔ لیکن اس دور کے بعض عزیزوں کی لوٹ کھسوٹ، دوستوں کی بے وفائی اور درپردہ دشمنی، ملازمت کے سلسلے میں خوشامدیوں کی ترقی اور بدنیتوں کے گلے میں طوق زر دیکھ کر رنگین شاعری سے طنز کی طرف چلا آیا۔"

---

[۱] نقوش۔ شخصیات نمبر، مضمون، شاد عارفی۔ از طاہرہ اختر۔ ص ۱۱۳۵

[۲] شاد عارفی۔ فن اور شخصیت، مضمون، آل احمد سرور۔ ص ۲۸

فراق گورکھپوری

(پیدائش ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء)

فراق گورکھپوری کی شاعری میں بھی خودداری کے نمونے ہم کو مل جاتے ہیں۔ فراق کی خوداری ان کی بے پناہ ذہانت بیکراں صلاحیت اور بے حد لیاقت پر مبنی ہے۔ انھوں نے بہ حیثیت شاعر قبولیتِ عام کا خلعت حاصل کر لیا ہے۔ اُردو شاعری میں ڈاکٹر اقبال کے بعد خیالات کی گہرائی اور گیرائی کے لحاظ سے اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ فراق ہی ہیں۔ اسی بنا پر ان کے کلام میں خوداری کی سنبھلی ہوئی اور متوازن جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

فراق نے اپنی زندگی میں بھی خودداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی خوداری کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ ان کا انتخاب پی۔سی۔ایس اور آئی۔سی۔ایس میں ہو گیا تھا، مگر ان کی خوددار طبیعت نے انگریزوں کی ملازمت کو گوارا نہیں کیا۔ اس لیے وہ کانگریس کی تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔

فراق نے اپنی خوداری کا ایک واقعہ بذات خود بیان کیا ہے، ان کا قول ہے کہ جب وہ جیل سے رہا ہو کر گورکھپور آئے تو ان کی مالی حالت نازک تھی۔ اسی دوران میں پنڈت جواہر لال نہرو گورکھپور آئے اور فراق کے یہاں مقیم ہوئے۔ فراق نے ان سے اپنا دُکھ درد نہیں بیان کیا۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے بذات خود معاملات کو بھانپ لیا، اور ان کو الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کا انڈر سکریٹری مقرر کر دیا۔ اس ملازمت سے ان کو ڈھائی سو روپے ماہوار ملنے لگے۔

فراق کی شاعری کا مطالعہ بھی اس راز کو منکشف کرتا ہے کہ وہ ایک خوددار شاعر ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

تری بے نیازی سے تجھ ہم بھی کہتے ۔۔۔ مگر کون لے دوست بات اپنی کھوئے

فراق کو اپنی بات کا بہت خیال ہے۔ اسی لیے ان کو اس کا احساس ہے کہیں

اس عبارت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شاد عارفی کی خود دار طبیعت نے بے انصافی گوارا نہیں کی۔

شاد کی خود داری کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے چھ سات ملازمتیں کیں لیکن ذرا سی توہین یا بے انصافی کی بنا پر استعفا دے دیا۔ طاہرہ اختر نے شاد عارفی کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کبھی کوئی ان سے ترکِ ملازمت کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ کہتے:

"اللہ میاں مجھے پریشان کرنے اور اپنے اطمینان کے لیے مجھے آدھ گھٹیا ملازمت دے کر جب بے فکر ہو جاتے ہیں تو میں استعفٰی دے کر انھیں پریشان کرنے لگتا ہوں کہ لاؤ رزاقِ مطلق ہو تو میرا انتظام کرو اور جیسا کہ میرا عقیدہ ہے کہ وہ اپنے رزاقِ مطلق ہونے کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔" [1]

شاد عارفی کی شاعری کی شفق میں بھی جا بجا خود داری کی سرخیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی خود داری میں یگانہ چنگیزی جیسی اکڑ پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں کا خمیر ایک ہی خاک سے تیار ہوا تھا۔ شاد عارفی فرماتے ہیں:

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا　　ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

دراصل کسی شخص کی تعریف کرنا شاد عارفی کی خود داری کے خلاف ہے۔ شاد محبوب سے بھی اکڑ کر بات کرتے ہیں:

چاہیے رواداری اے بتانِ سنگ دل　　آبرو نہیں بیچی، ہم نے آرزو کی ہے

شاد کی خود داری کے تیور مندرجہ ذیل شعر میں بھی دیکھیے:

کہہ رہے ہیں کہ پڑیں پاؤں نگہبانوں کے　　آپ ہم دردہیں ہم سوختہ سامانوں کے

دراصل کسی کے پاؤں پڑنا شاد عارفی کی فطرت کے خلاف ہے۔ شاد نے ساری زندگی مصیبت میں گزاری، مگر اپنی خود داری کو ترک نہیں کیا۔ ان کی خود داری کا رجحان ان کی نرگسیت کا آئینہ دار ہے۔

---

[1] نقوش، شخصیات نمبر، مضمون شاد عارفی۔ از طاہرہ اختر، ص ۱۱۳۴

ایسا نہ ہو کہ محبوب ان کی بات کو ٹھکرا دے

فراق کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ بھی محبوب سے بدگمان ہیں۔ اس قسم کی بدگمانی کا اظہار ایک خوددار عاشق ہی کر سکتا ہے۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

عہد و پیماں کوئی حسن بھی کیا کرے
عشق بھی تو ہے کچھ بدگماں بدگماں

فراق کا مندرجہ ذیل شعر بھی خودداری کی ایک حسین مثال ہے

رفیقِ زندگی تھی، اب انیسِ وقت آخر ہے
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

فراق کو موت کا بھی احسان پسند نہیں ہے۔ مگر جب ان کا دنیا میں کوئی ساتھی نہیں ہے تو انھوں نے مجبوراً موت کا احسان لینا گوارا کیا۔ چناں چہ یہی زندگی میں ان کی رفیق رہی اور اب وقتِ مرگ بھی ان کی انیس ...